چشمہ ٹھنڈے پانی کا

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

رسا چغتائی

ساقی اربابِ ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

پاس اپنے اک جان ہے سائیں
باقی یہ دیوان ہے سائیں

تیرے آنے کا انتظار رہا
عمر بھر موسمِ بہار رہا

چشمہ ٹھنڈے پانی کا

رسا چغتائی

کلام 1999ء - 1946ء

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ساقی ارباب ذوق

مجموعۂ کلام چشمہ ٹھنڈے پانی کا

شاعر رسا چغتائی

سنِ اشاعت 1999ء

کمپوزنگ ابرار احمد

تزئین خالد ایاز علی

قیمت دو سو روپے

0305 6406067

PDF Book Company

بہ اہتمام

خواجہ آشکار اکادمی

ناشر

ایس آر پبلی کیشنز، 42، پریس چیمبرز، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی

Ph:2211961 - 2211944 - 2217303 - Fax:2628201

email:saz@super.net.pk ☆ saz@pienet.net

پروفیسر خواجہ آشکار حسین مرحوم

کے نام

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

گرمی اس کے ہاتھوں کی
چشمہ ٹھنڈے پانی کا

آنا یارِ جانی کا
کھلنا رات کی رانی کا

پہلی آندھی موسم کی
پہلا سال جوانی کا

گرمی اس کے ہاتھوں کی
چشمہ ٹھنڈے پانی کا

لمبے سائے یادوں کے
شوق ورق گردانی کا

آنا جانا رہتا ہے
دریاؤں میں پانی کا

باہر ایک تماشا ہے
اندر کی حیرانی کا

آخر میرا کیا ہوگا
کیا ہوگا ویرانی کا

جاگ رہا ہے بستی میں
جنگل قصہ خوانی کا

گردوں ایک ہیولا ہے
نظروں کی جولانی کا

کیسا موسم آیا ہے
خوابوں کی ارزانی کا

سرد پڑا ہے منڈی میں
گرم لہو دہقانی کا

ساری عمر مشقت کی
خبط کیا سلطانی کا

کام لیا میں حکمت سے
عذر کیا نادانی کا

ڈیرہ دارن کیا جانے
پیار کسی مغلانی کا

میرے گھر میں رہتا ہے
دخل مری بے دھیانی کا

جل کٹیا میں بیٹھا ہے
لیکھک امر کہانی کا

○

خواب اس کے ہیں جو چُرا لے جائے
نیند اس کی ہے جو اُڑا لے جائے

زُلف اُس کی ہے جو اسے چھُو لے
بات اس کی ہے جو بنا لے جائے

تیغ اس کی ہے شاخِ گُل اس کی
جو اسے کھینچتا ہوا لے جائے

یوں تو اُس پاس کیا نہیں پھر بھی
ایک درویش کی دعا لے جائے

زخم ہو تو کوئی دہائی دے
تیر ہو تو کوئی اُٹھا لے جائے

قرض ہو تو کوئی ادا کر دے
ہاتھ ہو تو کوئی چھُڑا لے جائے

لَو دیے کی نگاہ میں رکھنا
جانے کس سمت راستہ لے جائے

دل میں آباد ہیں جو صدیوں سے
ان بُتوں کو کہاں خدا لے جائے

کب نہ جانے اُبل پڑے چشمہ
کب یہ صحرا مجھے بہا لے جائے

خواب ایسا کہ دیکھتے رہیے
یاد ایسی کہ حافظہ لے جائے

میں غریب الدّیار میرا کیا
موج لے جائے یا ہوا لے جائے

خاک ہونا ہی جب مقدّر ہے
اب جہاں بختِ نارسا لے جائے

○

دریا کل بھی آئے گا
اپنا جشن منائے گا

قطرہ قطرہ بارش کا
ساتھ بہا لے جائے گا

مِٹّی سونا اُگلے گی
وہ داتا کہلائے گا

رَستے چلتے جائیں گے
سورج ڈھلتا جائے گا

آنکھیں نم ہو جائیں گی
سایا گُم ہو جائے گا

کس کو اپنی آنکھوں سے
اپنے خواب دکھائے گا

کیا رکھا ہے بستی میں
کس سے سر ٹکرائے گا

اُونچے نیچے ٹیلوں سے
کب تک جی بہلائے گا

جب تک پتھر بولیں گے
تُو پتھر ہو جائے گا

رنگ ہَوا لے جائے گی
وقت ہَوا ہو جائے گا

لہریں باز نہ آئیں گی
ساحل ہاتھ نہ آئے گا

آنکھ کُھلے گی سپنے میں
سپنے میں سو جائے گا

راگی کیا بیراگی کیا
اپنا راگ سنائے گا

جیون دُکھ کی چھایا ہے
بیٹھے گا پچھتائے گا

دھیان نہ تھا اُس آنگن میں
دھیان پڑا رہ جائے گا

پیڑ شگوفے لائیں گے
چاند ہنڈولا لائے گا

شاخیں جُھولا جُھولیں گی
سایا پینگ بڑھائے گا

بُوندیں چھم چھم ناچیں گی
پربت ڈھول بجائے گا

قصہ گو اُٹھ جائیں گے
سنّاٹا چھا جائے گا

کون حنائی ہاتھوں کا
گلدستہ لہرائے گا

اب کیا آگے آتا ہے
آگے دیکھا جائے گا

عشق ہمارا مرشد ہے
مرشد راہ دکھائے گا

دیکھ رسؔا یہ کلجگ ہے
مان رسؔا پچھتائے گا

دریا شاید زوروں پر ہے
پانی چھت کی کوروں پر ہے

قطرہ قطرہ خونِ دل کا
اب تک اس کے پوروں پر ہے

ایسی نخوت ایسا غرّہ
آخر کن شہزوروں پر ہے

خاموشی کی ایک دھڑی سی
ان ہونٹوں کی کوروں پر ہے

اس جیون کا تانا بانا
ان آنکھوں کے ڈوروں پر ہے

بازاروں کی گھما گھمی
ان کھیتوں ان ڈھوروں پر ہے

رقص کریں یا ہجرت اب کے
یہ جنگل کے موروں پر ہے

زور یہاں ہر زور آور کا
اپنے سے کمزوروں پر ہے

دنیا بھر کی ذمّے داری
جیسے رسّا بس گوروں پر ہے

O

ہاتھ ترا کس شانے پر ہے
دستک کس دروازے پر ہے

میرا کیا ہے میں کیوں سوچوں
دنیا کس صدراہے پر ہے

اتنی ہی بس دھوپ ہے میری
جتنی پیڑ کے سائے پر ہے

زخمِ دل کی تازہ کاری
سرد ہَوا کے جھونکے پر ہے

دھرتی اپنے چکّر میں ہے
بادل اپنے دَورے پر ہے

باقی ان سانسوں کا رِشتہ
اُن کے آنے جانے پر ہے

جھلمل جھلمل ایک ستارہ
دُور کہیں اِک خیمے پر ہے

منظر منظر اس کا چہرہ
اب تک دل کے پردے پر ہے

کیسا گزرے کیونکر گزرے
آنے والے لمحے پر ہے

ہر شے کے انداز الگ ہیں
ہر شے اک اندازے پر ہے

اہلِ جنوں کی حلقہ بندی
زنجیروں کے حلقے پر ہے

جانے کن آنکھوں کا پہرہ
گلیوں کے سنّاٹے پر ہے

رقصِ غبارِ ناقۂ لیلیٰ
دل کے گاجے باجے پر ہے

مرزاؔ صاحب دل کی قیمت
گاہک کے دل آنے پر ہے

○

مٹّی جب تک نم رہتی ہے
خوشبو تازہ دَم رہتی ہے

اپنی رَو میں مست و غزل خواں
موجِ ہوائے غم رہتی ہے

وہ پردے میں لیکن عریاں
آبِ تیغِ ستم رہتی ہے

اُن جھیل سی گہری آنکھوں میں
اک لہر سی ہر دم رہتی ہے

ویسے بھی کچھ مہمانداری
بارش بارش کم رہتی ہے

ہر ساز جُدا کیوں ہوتا ہے
کیوں سنگت باہم رہتی ہے

کیوں آنگن ٹیڑھا لگتا ہے
کیوں پایل برہم رہتی ہے

اب ایسے سرکش قامت پر
کیوں تیغِ مژہ خم رہتی ہے

کیوں آپ پریشاں رہتے ہیں
کیوں آنکھ رسا نم رہتی ہے

یہ جو بادیدۂ تر آتا ہے
روز یہ شخص کدھر جاتا ہے

زندگی خواب نظر آتی ہے
خواب کچھ اور نظر آتا ہے

کوئی صورت ہو بدل جاتی ہے
کوئی نشّہ ہو اُتر جاتا ہے

طَور بے طور ہَوا چلتی ہے
تال بے تال شجر گاتا ہے

تُو کسی روز اِدھر آکر دیکھ
آسماں روز اِدھر آتا ہے

دل سے آگے کوئی صحرا ہے نہ باغ
تو دَبے پاؤں کدھر جاتا ہے

مرنے والے کا زمیں سے رشتہ
کتنا شایستہ نظر آتا ہے

درد کی تیز ہواؤں میں رسا
دل تو کیا دشت بکھر جاتا ہے

○

کوئی طوفان اس نظر میں تھا
زور اتنا کہاں بھنور میں تھا

زندگی زہر کا پیالہ تھی
میں کسی نشۂ دِگر میں تھا

سر میں سودائے عشق تھا ورنہ
حُسن ہی حُسن رہگزر میں تھا

ہم سے پہلے بھی عشق کا چرچا
بستی بستی نگر نگر میں تھا

ڈھونڈتے کیا بچھڑنے والوں کو
وقت اتنا کہاں سفر میں تھا

چند قصے کہانیوں کے سوا
اور کیا دامنِ شجر میں تھا

میں کسی خواب کے تعاقب میں
وہ کسی حلقۂ اثر میں تھا

اہلِ دل کے لیے گنوانے کو
خاک اس عمرِ مختصر میں تھا

اب نہیں ہے تو یاد آتا ہے
ویسے بدنام شہر بھر میں تھا

کیسی ویرانگی ہے آنکھوں میں
کون آباد اس نگر میں تھا

اِک ترے انتظار سے پہلے
حبس کیسا عجیب گھر میں تھا

شاخِ گُل لے رہی تھی انگڑائی
ہاتھ کس کا رسا کمر میں تھا

○

ہَوا کس کا تعاقب کر رہی ہے
یہ ہرنی کیوں زقندیں بھر رہی ہے

سمندر کی طرح بیکل رہا ہوں
عجب ہلچل مرے اندر رہی ہے

کبھی موسم ہلاکو خاں رہے ہیں
کبھی یلغار بے لشکر رہی ہے

عمارت غمزہ و ناز و ادا کی
ستونِ جاں گزاری پر رہی ہے

نہ یہ آنسو کبھی پتھّر رہے ہیں
نہ یہ وادی کبھی بنجر رہی ہے

اُسے دیکھوں تو یوں لگتا ہے جیسے
کبھی یہ خاک جادوگر رہی ہے

تراشا ہے اسے بھی تو کسی نے
یہ مورت بھی کبھی پتّھر رہی ہے

کہیں میں بند ہو کر رہ گیا ہوں
گھڑی کی سُوئی گردش کر رہی ہے

کسی زخمی پرندے کی طرح چپ
نظر کمرے کی کھڑکی پر رہی ہے

برائی کیا ہے اس سے مشورے میں
وہ قتّالہ بھی چارہ گر رہی ہے

ادا ناآشنا ہم بھی نہیں ہیں
یہ کس کافر پہ خلقت مر رہی ہے

مجھے کیسے بُھلا سکتی ہے دُنیا
مرے خوابوں کی سوداگر رہی ہے

میں تیرے پیار سے انکار کر دوں
یہ خواہش بھی مرے اندر رہی ہے

سنا ہم نے بھی ہے ریگِ رواں سے
کہ یہ بستی بڑی خودسر رہی ہے

رسا دیکھے تو کہہ سکتا ہے کوئی
کبھی یہ آنکھ بے منظر رہی ہے

○

آتی ہے شام کس نگر سے
تکتا ہوں راہ دوپہر سے

جی چاہتا ہے ڈوب جاؤں
آئی ہے لہر یہ کدھر سے

پہلے گرا زمیں پہ سایا
پھر دھوپ گر گئی شجر سے

گھایل کیا کسی نظر نے
مرہم ملا کسی نظر سے

دل کیا بجُھا کہ روشنی کا
ایمان گیا چراغ پر سے

کرتا ہوں قتل روز خود کو
لیتا ہوں کام درگزر سے

یہ کیا ہوا کہ چلتے چلتے
اوجھل ہوئے تری نظر سے

ایسے خلانوردِ غم کی
مشکل ہے واپسی سفر سے

آجائے کب نہ جانے دریا
کٹ جائے کب زمیں کدھر سے

پر تولنے لگے پرندے
منہ موڑنے لگے شجر سے

آندھی کو کیا غرض کہ تنکے
لاتی ہے فاختہ کدھر سے

دل پر کُھلا یہ چاندنی میں
آباد زمین ہے کھنڈر سے

لگتا تو ہے بُرا مجھے بھی
چلنا مرا الگ ڈگر سے

کس سوچ میں کھڑے ہو مرزاؔ
کیا سوچ کر چلے تھے گھر سے

○

دل نے اپنی زباں کا پاس کیا
آنکھ نے جانے کیا قیاس کیا

کیا کہا بادِ صبح گاہی نے
کیا چراغوں نے اِلتماس کیا

بال تو دھوپ میں سفید کیے
زرد کس چھاؤں میں لباس کیا

کیا ترا اعتبار تھا تُو نے
کیا غضب شہرِ ناسپاس کیا

کیا بتاؤں سبب اُداسی کا
بے سبب میں اسے اُداس کیا

کچھ عجب طور زندگانی کی
گھر سے نکلے نہ گھر کا پاس کیا

عشق جی جان سے کیا ہم نے
اور بے خوف و بے ہراس کیا

رات آئی ادھر ستاروں نے
شبنمی پیرہن لباس کیا

سایۂ گُل تو میں نہیں جس نے
گُل کو دیکھا نہ گُل کو باس کیا

زندگی اِک کتاب ہے جس سے
جس نے جتنا بھی اقتباس کیا

جب بھی ذکرِ غزل چھڑا اس نے
ذکر میرا بطورِ خاص کیا

○

دیدنی اک جہان ہے پر کیا
اس کے در سے اُٹھایئے سر کیا

اِک معمّہ ہے گنبدِ بے در
اِک کہانی ہے ساتواں در کیا

شہر کا شہر سیلِ آب میں ہے
راہ میں مجھ غریب کا گھر کیا

ایک مجذوب کی ولایت میں
پتھروں سے بچایئے سر کیا

شام آتے ہی اژدھے کی طرح
سرسراتی ہے بادِ صر صر کیا

میرے اُٹھنے سے جاگ اُٹھے گا
کوئی سویا ہوا مقدّر کیا

عمر بھر گردِ رہ گزر کی طرح
کاٹیے اس گلی کے چکّر کیا

روز یادوں کے سائبان تلے
باندھیے آنسوؤں کی جھالر کیا

رینگتا ہے زمین کے اُوپر
کھوجتا ہے زمیں کے اندر کیا

سر پہ کیوں آسماں مسلّط ہے
قرض ہے اس زمیں کے اُوپر کیا

جو بھی اب راستے میں آجائے
کوہ کیا دشت کیا سمندر کیا

پاسدارانِ حرف کے آگے
چل رہی ہے زبانِ خنجر کیا

کوئی کہتا نہیں خدا لگتی
آدمی ہو گیا ہے پتّھر کیا

ان لبوں کے سوا بھی ہوتی ہے
کوئی تعریفِ مصرعۂ تر کیا

اس کھلے آسمان کے نیچے
یاد آتا نہیں رسا گھر کیا

○

باغ اُجڑے ہوئے زمانہ ہوا
خونِ دل نذرِ آبیانہ ہوا

خواب اپنی جگہ پرندوں کے
آشیانہ ہوا ہوا نہ ہوا

تیر جب بھی کمان سے نکلا
کوئی معصوم ہی نشانہ ہوا

اس سے پہلے کہ جی قفس میں لگے
منتقل اپنا آب و دانہ ہوا

کس نے توڑا یہ آئینہ دل کا
گوشہ گوشہ نگار خانہ ہوا

میں اسے آج ہو بہو دیکھا
خواب گویا پیمبرانہ ہوا

اس سے بارِ مژہ نہیں اُٹھا
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

ایسا اوجھل ہوا کہ آنکھوں سے
ایک پل کے لیے جُدا نہ ہوا

نرم مٹّی پہ بادلوں کا گزر
اب کے موسم میں دلبرانہ ہوا

اس کے آنسو نہیں ستارے ہوئے
دل نہیں درد کا خزانہ ہوا

ایسا لگتا ہے جیسے آنکھوں کو
"خواب دیکھے ہوئے زمانہ ہوا"

اس خدا کی زمین پر قبضہ
ہر زمانے میں غاصبانہ ہوا

خیر مقدم ترے اسیروں کا
شہر میں کیسا والہانہ ہوا

مجھ کو انکارِ جرم عشق نہیں
فیصلہ گرچہ آمرانہ ہوا

ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کا
کیا ہواؤں سے دوستانہ ہوا

اب کہیں سچ عیاں نہ ہو جائے
جھوٹ بولے ہوئے زمانہ ہوا

وہ بھی کیا محفلِ سخن جس میں
ہم ہوئے تم ہوئے رسؔا نہ ہوا

○

جب تک دورِ جام چلے گا
ساقی تیرا نام چلے گا

مندر میں زنّار چلے گی
کعبے میں احرام چلے گا

جوگی کا سنجوگ نہیں تو
صوفی کا الہام چلے گا

زینہ زینہ ان زُلفوں کا
فتنہ سُوئے بام چلے گا

رستے سو اعجاز کریں گے
جب وہ سرو اندام چلے گا

سناٹے بسرام کریں گے
بستی میں کہرام چلے گا

کب تک یہ دن رات چلیں گے
کب تک یہ ابہام چلے گا

کب تک لب خاموش رہیں گے
کب تک یہ ہنگام چلے گا

کیا میری تدبیر چلے گی
کیا میرا اقدام چلے گا

جب تک سر پہ دھوپ کھڑی ہے
سایہ بے آرام چلے گا

کوئی نرم ہوا کا جھونکا
صبح نہیں تو شام چلے گا

ایسے کیسے بات بنے گی
ایسے کیسے کام چلے گا

دنیا کا یہ گورکھ دھندا
کیسے بے اوہام چلے گا

○

جُھٹ پُٹا سا خیال کا ہوتا
اور دل ڈُوب سا رہا ہوتا

راہ چلنے میں اک لہک ہوتی
لڑکھڑانے میں اک مزا ہوتا

کیسی جنت یہیں کہیں کوئی
ایک ویران باغ سا ہوتا

سر پہ اک سائبان ہے وہ بھی
آپ کہتے تو ڈھا دیا ہوتا

لہر میں ہے چراغِ دل ورنہ
شام ہی سے بُجھا ہوا ہوتا

اس جہانِ خراب میں آباد
ہم نہ ہوتے تو کیا خدا ہوتا

رات تو اک ہُوا کے جھونکے نے
مجھے پاگل بنا دیا ہوتا

وہ تری یاد تھی جو لے آئی
میں نہ جانے کہاں پڑا ہوتا

چاند ہوتا کہیں سرِ کہسار
اور میں لڑکھڑا رہا ہوتا

عمر جیسے گزر گئی پیارے
تُو بھی ویسے گزر گیا ہوتا

ہم اسے حادثہ سمجھ لیتے
وہ اگر کوئی حادثہ ہوتا

یہ گھروندا ہمارا بچپن ہے
اک نظر دیکھ تو لیا ہوتا

آپ اپنی گزارتے صاحب
مرنے دیتے جو مر رہا ہوتا

بے ارادہ سہی کبھی ہم سے
بے تکلّف سخن کیا ہوتا

ہم بھی رُکتے اگر کوئی لمحہ
ایک پَل کے لیے رُکا ہوتا

خشک پتّے جلا لیے ہوتے
کچھ اَندھیرا ہی رُونما ہوتا

آن اپنی جگہ رسؔا مرزا
عشق تو ٹوٹ کر کیا ہوتا

اب خدائے سخن تو کیا کوئی
ثانئ میرزا رسؔا ہوتا

دیکھ مجھے میں فردا ہوں
خواب میں تیرے آیا ہوں

یہ بھی سچ ہے پیاسا ہوں
یہ بھی سچ ہے دریا ہوں

درد نہیں تو دل کیا ہے
عشق نہیں تو میں کیا ہوں

عمر پڑی ہے رولینا
یار ابھی میں زندہ ہوں

ممکن ہے وہ دوست نہ ہو
دشمن تو میں اپنا ہوں

آگ لگا کر پانی میں
جل کٹیا میں بیٹھا ہوں

پھیل رہی ہے تنہائی
جان رہی ہے تنہا ہوں

شاید دل کی آگ بُجھے
انگاروں پہ چلتا ہوں

میں کیا میری منزل کیا
ایک ہَوا کا جھونکا ہوں

اپنے اور پرائے کیا
خود سے بھی کب ملتا ہوں

کون مرا ہمسایہ ہے
خود اپنا ہمسایہ ہوں

سیرِ گُل کو نکلا تھا
چاک گریباں آیا ہوں

آنکھیں یونہی گویا ہیں
میں یونہی لب بستہ ہوں

لوگ بمشکل جاگے ہیں
آج بمشکل سویا ہوں

برسوں اِک اِک دانے کو
اک اک بُوند کو ترسا ہوں

اب یہ مٹی میری ہے
اب میں اس کا حصّہ ہوں

نام سنا تھا سائیں کا
بھول ہوئی شرمندہ ہوں

میرا اپنا منصب ہے
صدر نشینِ صحرا ہوں

تو بھی ایک معمّہ ہے
میں بھی ایک معمّہ ہوں

رَستے چلتے رہتے ہیں
آہٹ سنتا رہتا ہوں

قصہ گو سو جاتے ہیں
میں تنہا رہ جاتا ہوں

یہ کیسا سناٹا ہے
میں کیسا افسانہ ہوں

ویرانے کو باغ رہا
شہر کو صحرا لکھتا ہوں

○

پیار ایسا نہ یار ایسا ہے
کیوں یہ دل بے قرار ایسا ہے

یا اسے دیکھنا پسند نہیں
یا مرا حالِ زار ایسا ہے

چھاؤں ایسی نہ دھوپ ہے ایسی
رنگِ لیل و نہار ایسا ہے

ایک مدّت سے اس خرابے میں
شور، بادِ بہار ایسا ہے

آدمی صاحب الدیار ایسا
یا غریب الدیار ایسا ہے

ڈھونڈیے اب کہاں دکانِ دل
شہر میں خلفشار ایسا ہے

شاہراہوں پہ اجنبی چہرے
گھر میں گردوغبار ایسا ہے

میں سمجھتا ہوں وہ نہیں ایسا
نشۂ اقتدار ایسا ہے

○

میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا
چاہتا ہے وہ اس قدر مجھ کو

نہ طاقِ شب نہ چراغِ سحر کو دیکھتے ہیں
یہ خواب خواب دریچے کدھر کو دیکھتے ہیں

ہَوا جدھر کی چلے تم اُدھر کو دیکھتے ہو
دھواں جدھر سے اُٹھے ہم اُدھر کو دیکھتے ہیں

عجیب ہوتے ہیں ظالم ہَوا کے جھونکے بھی
ردائے گُل نہ کلاہِ شجر کو دیکھتے ہیں

چھلک رہی ہے مئے ناب آبگینوں سے
کہ دستِ شاخ میں گلہائے تر کو دیکھتے ہیں

یہ رات ہے کہ ستاروں کی انجمن سائیں
یہ کشتِ جاں ہے کہ صحرائے تھر کو دیکھتے ہیں

بُجھا تھا دل تو چراغاں کیا تھا دنیا نے
دھواں اُٹھا ہے تو دیوار و دَر کو دیکھتے ہیں

نہ دل میں خواہشِ مال و منال ہے مرزا
نہ اس نگاہ سے عرضِ ہنر کو دیکھتے ہیں

کیسے کیسے خواب دیکھے دربدر کیسے ہوئے
کیا بتائیں روز و شب اپنے بسر کیسے ہوئے

ان ہواؤں کو ردائے بادباں کیسے ملی
یہ ستارے آبنائے چشم تر کیسے ہوئے

نیند کب آنکھوں میں آئی کب ہوا ایسی چلی
سائباں کیسے اُڑے ویراں نگر کیسے ہوئے

جُھٹ پٹے میں شام کے پرچھائیاں کیسے ملیں
اور پھر آنکھوں سے او جھل بام و در کیسے ہوئے

کیا کہیں وہ زُلفِ سرکش کس طرح ہم پر کھلی
ہم طرفدارِ ہوائے رہ گزر کیسے ہوئے

حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں مگر یہ حادثے
اک ذرا سی زندگی میں اس قدر کیسے ہوئے

ایک تھی منزل ہماری ایک تھی راہِ سفر
چلتے چلتے تم اُدھر اور ہم اِدھر کیسے ہوئے

شعر لکھنا ہی فقط کافی نہیں مرزا رسا
جانتے ہو شاعر اتنے نامور کیسے ہوئے

○

خواب اپنے دِکھائیے کس کو
جاگیئے کیا جگائیے کس کو

اس خرابے میں جائیے کس پاس
پاس اپنے بلائیے کس کو

بیٹھیے کس شجر کے سائے میں
حال اپنا سنائیے کس کو

وہ شب و روز وہ گلی کوچے
یاد کیا کیا دلائیے کس کو

زندگی ہے رفاقتوں کا سفر
اس سفر میں گنوایئے کس کو

منصفی مانگئے یہاں کس سے
جُرم اپنا بتایئے کس کو

کس کے رُخ سے اُٹھایئے پردہ
کس کا چہرہ دکھایئے کس کو

یہ خدا کی زمین ہے صاحب
اس زمیں سے اُٹھایئے کس کو

جب کوئی پوچھتا نہیں توؔرسا
نام اپنا بتایئے کس کو

○

اُس زلفِ سیاہ تاب نے بَل کھائے ہیں کیا کیا
جب تک دلِ آوارہ تہِ دام نہ آیا

عرصۂ وحشت میں تا حدِّ نظر کوئی نہیں
نقشِ پا کوئی نہیں راہِ مفر کوئی نہیں

گھر جہاں ہوتا ہے ہوتی ہے وہاں ہمسائگی
اس بھری بستی میں یعنی میرا گھر کوئی نہیں

یا نظر آتا نہیں یا ان چراغوں کا دھواں
دیکھنے والا یہاں اے دیدہ ور کوئی نہیں

اب جہاں میں ہوں وہاں آرام ہی آرام ہے
یہ بھی کوئی زندگی ہے دردِ سر کوئی نہیں

اس خرابے میں تجھے کس کا پتہ درکار ہے
ہم نہیں تو اے ہوائے رہ گزر کوئی نہیں

اب غزل کی اور کیا تعریف ہو مرزا رسا
اس سے بہتر مصرفِ خونِ جگر کوئی نہیں

سب تعلق کے استعارے ہیں
دوست دشمن سبھی ہمارے ہیں

ہم پہ کیا آسماں برستا ہے
ہم تو یونہی زمیں کے مارے ہیں

کیا بتائیں کہ یہ دیے ہم نے
کن در و بام سے اُتارے ہیں

میں پریشان ہوں تو اس نے بھی
بال اپنے کہاں سنوارے ہیں

چاندنی ہے کہ گردِ تنہائی
یہ دُھواں ہے کہ ابر پارے ہیں

شام ہی سے برس رہی ہے رات
میرے آنسو ہیں یا ستارے ہیں

اب یہی جمع و خرچ ہے اپنا
اب یہی روز و شب ہمارے ہیں

اب نہ وہ پیچ و تاب دریا ہے
اب نہ وہ مہرباں کنارے ہیں

جانتے ہو زمین کس کی ہے
پاؤں کیا سوچ کر پسارے ہیں

یاد رکھو کسی حوالے سے
ہر حوالے سے ہم تمہارے ہیں

دل کبھی درد کا ادارہ تھا
آج ایسے کہاں ادارے ہیں

اور کچھ دن گزار لیں گے رسؔا
جب یہاں اتنے دن گزارے ہیں

شہرِ دل کی سربراہی اور ہے
آپ کی عالَم پناہی اور ہے

زندگی ہے آپ ہی اپنا سفر
دیکھنے میں گرچہ راہی اور ہے

آپ کا رُوئے سخن اپنی جگہ
ہمکلامی کا مزا ہی اور ہے

جو سنا وہ قصۂ درویش تھا
داستانِ قصرِ شاہی اور ہے

جس کی خاطر شہر ہے میرے خلاف
ایک بس اس کی گواہی اور ہے

آنکھ سے اٹھتا نہیں بارِ حیا
یا جوازِ کم نگاہی اور ہے

کاتبِ تقدیر کا لکھا ہے اور
نامۂ شب کی سیاہی اور ہے

یہ کشید خونِ دل ہے محتسب
یہ پیالہ یہ صراحی اور ہے

عالمِ دریا تہہ دریا ہے اور
سیر گاہِ موج و ماہی اور ہے

دیکھتے چلیئے سر میدان شب
آنے والا اک سیاہی اور ہے

دل کہو دریا کہو صحرا کہو
کچھ کہو یہ دل بلا ہی اور ہے

کل ملے تھے جس رسؔا مرزا سے ہم
آج وہ مرزا رسؔا ہی اور ہے

دیکھتی ہے رات بستر کی طرف
دیکھیے کیا خاک باہر کی طرف

باغ سارا شاخِ گل کا ہمنوا
خشک پتّے بادِ صرصر کی طرف

جھیل کی آغوش میں پرچھائیاں
لڑکیوں کا دھیان گاگر کی طرف

دل سے کیوں جاتا نہیں گھر کا خیال
کیوں قدم اُٹھتے نہیں گھر کی طرف

چھوڑ کر تنہا نکل جاتا ہے دن
جانے کس تاریک منظر کی طرف

ٹوٹتا رہتا ہوں شیشے کی طرح
دیکھتا رہتا ہوں پتھّر کی طرف

کوئی رُت ہو طائرانِ حرفِ دل
اُڑ کے آتے ہیں سخنور کی طرف

چل پڑے تو اب رسا کیا دیکھنا
زندگی کے لاو لشکر کی طرف

O

دیئے جلائے تھے ہم نے وفا کے رستے میں
نہ جانے آ گئے کیسے ہوا کے رستے میں

میں آج بھی وہیں بیٹھا ہوں نقشِ پا کی طرح
جہاں گیا تھا مجھے وہ بٹھا کے رستے میں

پھر اس کے بعد نہ طوفانِ گردوباد آیا
نہ کوئی بادیہ پیما ہوا کے رستے میں

کچھ اپنے واسطے اچھا نہیں کیا تم نے
ہمارے واسطے کانٹے بچھا کے رستے میں

یہی نشان ہے میرا کہ چھوڑ آیا ہوں
میں اپنے نام کا کتبہ لگا کے رستے میں

پیالہ ہو تو اُچھالوں شراب ہو تو پیوں
حیات ہو تو لٹاؤں قضا کے رستے میں

یہ زندگی گزراں ہے گزر ہی جائے گی
اِدھر اُدھر کے فسانے سنا کے رستے میں

ہوا کدھر کی چلے یہ ہوا کی مرضی ہے
ہزار بیٹھیے آ کر ہوا کے رستے میں

یہ اور بات اُجالا نہ کر سکے لیکن
چراغ چھوڑ چلے ہم جلا کے رستے میں

عجب نہیں جو کبھی پھر کسی بہانے آئے
ابھی گیا ہے جو آنکھیں دکھا کے رستے میں

نہ جانے شور مچاتی یہ نامراد ہوا
کہاں سے آ گئی آوازِ پا کے رستے میں

کوئی تو ہو جو نبرد آزما ہو رستوں سے
کوئی تو ہو جو چلے سر اُٹھا کے رستے میں

سوال کرنا ہی ٹھیرا تو کیوں نہ جا بیٹھوں
کہیں فقیر کی صورت بنا کے رستے میں

ہزارہا شجرِ سایہ دار تھے لیکن
کسی نے بات نہ پوچھی بٹھا کے رستے میں

تمھارے خواب الگ ہیں تمھیں رسّا مرزا
ملے گا کیا یہاں آنکھیں بچھا کے رستے میں

اپنے دوست حبیب جالبؔ کے لیے جالبؔ کی زمین میں

○

عارضوں کو ترے کنول کہنا
اتنا آساں نہیں غزل کہنا

ہم بھی بیٹھے ہیں گوش بر آواز
رفتگاں سے ذرا اجل کہنا

آج موضوعِ گفتگو ہے حیات
اب کوئی اور بات کل کہنا

رندانِ تہی جام ہیں کچھ اور طرح کے
یارانِ مے آشام ہیں کچھ اور طرح کے

کیا جانیے کافر ہیں کہ مومن ہیں مگر ہم
سرگشتۂ اوہام ہیں کچھ اور طرح کے

بکتے ہیں نہ جھکتے ہیں نہ رکھتے ہیں عداوت
ہم بندۂ بے دام ہیں کچھ اور طرح کے

اس شہر میں آباد غریب الوطنی ہے
غربت کے یہاں نام ہیں کچھ اور طرح کے

وہ آنکھ سخن ساز ہے کچھ اور طرح کی
اس زُلف کے اقدام ہیں کچھ اور طرح کے

رودادِ غمِ عشق ہے کچھ اور طرح کی
افسانے مگر عام ہیں کچھ اور طرح کے

تعمیرِ دلِ زار ہے کچھ اور طرح کی
اس گھر کے در و بام ہیں کچھ اور طرح کے

مصروف ہر اک شخص ہے، اس شہر میں لیکن
کچھ ہیں کہ جنہیں کام ہیں کچھ اور طرح کے

چلتی ہے رسا عشق میں بس دل کی گواہی
ہر چند کہ احکام ہیں کچھ اور طرح کے

O

جانتا کوئی نہیں تقدیر کیا ہے کیا نہیں
اس ورق کے اُس طرف تحریر کیا ہے کیا نہیں

زندگی ہوتی ہے کیا عمرِ رواں کیا چیز ہے
وقت کیا ہے وقت کی تعبیر کیا ہے کیا نہیں

شہر کی گنجان سڑکوں پر بگولوں کی طرح
موت کا یہ رقصِ بے زنجیر کیا ہے کیا نہیں

آپ کا ہر فیصلہ میرے لیے اعزاز ہے
اس کو جانے دیجیے تقصیر کیا ہے کیا نہیں

اس کہانی میں نہ جانے کیا مرا کردار ہے
اور کس کردار کی تفسیر کیا ہے کیا نہیں

کیا بتاؤں کون اس دل کے نہاں خانے میں ہے
کیا کہوں وہ پیکرِ تصویر کیا ہے کیا نہیں

اک اسیرِ زُلف سے کیا پوچھتے ہو ناصحو
زُلف کیا ہے کیا نہیں زنجیر کیا ہے کیا نہیں

آپ کیا جانیں کہ زخمِ بے دلی ہوتا ہے کیا
اور پاسِ خاطرِ دلگیر کیا ہے کیا نہیں

قصرِ دل ڈھایا ہے جس نے یہ اسی سے پوچھیے
اس میں مضمر صورتِ تعمیر کیا ہے کیا نہیں

بے خیالی کو خیالِ یار باندھ
دشت کو ہم معنیِ گلزار باندھ

پھر مری آنکھوں سے اپنے خواب دیکھ
دل سے پیمانِ وفا اک بار باندھ

آئینے کے اور کچھ اسرار کھول
زُلف کو کچھ اور پُراسرار باندھ

یا غبارِ راہ کو سر پہ بٹھا
یا حصارِ سایۂ اشجار باندھ

یا ہوائے شوق کو مہمیز کر
یا سمندِ عمر کی رفتار باندھ

یا تو بارِ منّتِ درباں اُٹھا
یا کوئی طرّہ سرِ دستار باندھ

ساقی اردو
0305 6406067
PDF Book Company

اس عجائب خانۂ دل میں کوئی
اک الگ گوشہ پئے دلدار باندھ

اب کوئی بھی خواب کا عالم کھلے
رنگ اپنا دیدۂ بیدار باندھ

گنگنائے خود رسا جن کو ردیف
قافیے ایسے کوئی دوچار باندھ

○

چلمن ڈالے شب کیسی
دھوپ دکھائے چھب کیسی

لایعنی کے صحرا میں
سیرِ روز و شب کیسی

اپنی سزا ہم کاٹ آئے
ہم سے پُرسش اب کیسی

دل کی باتیں دنیا کو
لگتی ہیں بے ڈھب کیسی

اس کی مرضی وہ جانے
کب دکھلائے چھب کیسی

بال بنائے کب کیسے
سیج سجائے کب کیسی

اس کو اپنے مطلب کی
باتیں یاد ہیں سب کیسی

○

کہیں انسان بے چہرا کھڑا ہے
کہیں بے دست و پا سایا پڑا ہے

نہ کوئی پشت پر ہے زخم ایسا
نہ سینے میں کوئی خنجر گڑا ہے

جدھر دیکھو ادھر لاشیں پڑی ہیں
جہاں جاؤ وہاں تالا پڑا ہے

میں یوں بھی کون سا زندہ تھا پہلے
جو مرنے کا مرے قصہ گھڑا ہے

برستا ہے نہ ٹلتا ہے یہاں سے
یہ بادل کس لیے سر پہ کھڑا ہے

ابھی ہیں اور ابھی موجیں نہیں ہیں
یہ ساحل کس تردّد میں پڑا ہے

نہ پینے کے لیے آنسو ہیں باقی؟
نہ پانی کے لیے کوئی گھڑا ہے

نہ لوگوں سے شناسائی ہے ایسی
نہ کوئی نام ہی ایسا بڑا ہے

تری یادوں کا یہ مہمان خانہ
زمانہ ہو گیا ویراں پڑا ہے

یہ صحرا ہے کہ میری زندگانی
یہ سایا ہے کہ میرا جھونپڑا ہے

نظر آتا نہیں کیا پیرہن سے
کہاں موتی کہاں ہیرا جڑا ہے

اچانک جیسے پتھر ہو گیا ہو
رسا کیوں اس طرح گُم صُم کھڑا ہے

(یہاں اس قافیے کو روا رکھا ہے)

O

یہ ہنگامہ بپا کس کے لیے ہے
یہ شورِ بے صدا کس کے لیے ہے

یہ کس کی کھوج میں سایا ہے میرا
یہ مجھ سے بھاگتا کس کے لیے ہے

نکلتے ہیں ستارے کس کی خاطر
یہ سورج ڈوبتا کس کے لیے ہے

یہ کس کی گونج ہے تارِ نفس میں
یہ دل نغمہ سرا کس کے لیے ہے

یہ گلیاں اس قدر سنسان کیوں ہیں
یہ گھر آراستہ کس کے لیے ہے

بلاتے ہیں کسے پلکوں کے سائے
یہ جھونکا نیند کا کس کے لیے ہے

یہ آخر وقت کیا ہے اور کیوں ہے
یہ عمرِ بے وفا کس کے لیے ہے

گزر جاتی ہیں صدیاں ایک پل میں
یہ پل ٹھیرا ہوا کس کے لیے ہے

اگر میں ہوں تو میں کس کے لیے ہوں
خدا ہے تو خدا کس کے لیے ہے

کسے بتلاؤں کیوں صحرا نشیں ہوں
یہ مٹّی کا دیا کس کے لیے ہے

نکل آئے یہ ہم کس راستے پر
یہ آخر راستہ کس کے لیے ہے

مجھے جو جانتا ہے جانتا ہے
میرے دامن میں کیا کس کے لیے ہے

کیا ہے نصب کس نے راستے میں
یہ پتّھر رہنما کس کے لیے ہے

یہ تیرا حوصلہ شہرِ کراچی
یہ تیرا ولولہ کس کے لیے ہے

وہ گھما گھمیاں کس کے لیے تھیں
یہ سنّاٹا رسا کس کے لیے ہے

○

پرسشِ حالِ دلِ زار نہ کر
بات بڑھ جائے گی اصرار نہ کر

جو آتا ہے نظر ویسا ہی کیوں ہو
کہ ہر محمل نشیں لیلیٰ ہی کیوں ہو

نہ جائے جو ترے کوچے سے ہو کر
ہمارے گھر کا وہ رستہ ہی کیوں ہو

مرے ہاتھوں میں تیرا ہاتھ آئے
سہارے کے لیے تنکا ہی کیوں ہو

ملا وہ شخص تو اپنا لگا کیوں
گیا جو شخص وہ اپنا ہی کیوں ہو

ہمارے نام سے منسوب کوئی
ستارہ ڈوبنے والا ہی کیوں ہو

کُھلا یہ عشق میں تیرے کہ دریا
اگر دریا نہ ہو پیاسا ہی کیوں ہو

نہ ہو کیوں رقص میں کوئی گل تر
غبارِ دامنِ صحرا ہی کیوں ہو

اندھیرا ابھی تو ہو سکتا ہے چھت پر
کسی آسیب کا سایا ہی کیوں ہو

یہ دنیا میں رسا جو ہو رہا ہے
وہ سب تقدیر کا لکھا ہی کیوں ہو

○

ترے نزدیک آکر سوچتا ہوں
میں زندہ تھا کہ اب زندہ ہوا ہوں

جن آنکھوں سے مجھے تم دیکھتے ہو
میں ان آنکھوں سے دنیا دیکھتا ہوں

خدا جانے مری گٹھری میں کیا ہے
نہ جانے کیوں اُٹھائے پھر رہا ہوں

یہ کوئی اور ہے اے عکس دریا
میں اپنے عکس کو پہچانتا ہوں

نہ آدم ہے نہ آدم زاد کوئی
کن آوازوں سے سر ٹکرا رہا ہوں

مجھے اس بھیڑ میں لگتا ہے ایسا
کہ میں خود سے بچھڑ کے رہ گیا ہوں

جسے سمجھا نہیں شاید کسی نے
میں اپنے عہد کا وہ سانحہ ہوں

نہ جانے کیوں یہ سانسیں چل رہی ہیں
میں اپنی زندگی تو جی چکا ہوں

جہاں موجِ حوادث چاہے لے جائے
خدا ہوں میں نہ کوئی ناخدا ہوں

جنوں کیسا کہاں کا عشق صاحب
میں اپنے آپ ہی میں مبتلا ہوں

طرارے بھر رہا ہے وقت یارب
کہ میں ہی چلتے چلتے رُک گیا ہوں

وہ پہروں آئینہ کیوں دیکھتا ہے
مگر یہ بات میں کیوں سوچتا ہوں

اگر وہ محفلِ بنتِ عنب ہے
تو میں ایسا کہاں کا پارسا ہوں

غمِ اندیشہ ہائے زندگی کیا
تپش سے آگہی کی جل رہا ہوں

ابھی یہ بھی نہیں جانا کہ مرزاؔ
میں کیا ہوں کون ہوں کیا کر رہا ہوں

○

آہٹیں سُن رہا ہوں یادوں کی
آج بھی اپنے انتظار میں گم

تیغِ ادا کھینچی ہوئی تسمۂ پا کسے ہوئے
کیسے نہ جانے رہ گئے بندِ قبا کھلے ہوئے

چادرِ ماہتاب میں لپٹی ہوئی وہ مطربہ
شیشۂ آبجو میں وہ ساغرِ مے بھرے ہوئے

خواب وہی فقیر کے کھیل وہی لکیر کے
راہ تھکی ہوئی نقش مٹے مٹے ہوئے

تیرے ہی شہر میں تجھے کاش کبھی دکھائی دے
لاش کوئی پڑی ہوئی زخم ترے دیے ہوئے

فکرِ معاش ہے تمھیں کس کی تلاش ہے تمھیں
پھرتے ہو شہر میں رسا کس کا پتہ لیے ہوئے

○

نہ کنجِ شب نہ سوادِ سحر سے آتے ہیں
یہ خواب خواب پرندے کدھر سے آتے ہیں

چلتے چلتے زمیں تمام ہوئی
کس بیاباں میں آ کے شام ہوئی

یوں گنواتا ہے کوئی جانِ عزیز
زندگی ہوتی تو ہم رکھتے عزیز

یا گزرتے ہی نہ تھے یا اب ہمیں
کچھ زیادہ ہو گئے لمحے عزیز

کیا بتائیں اب بکھر جانے کے بعد
آشیاں تھا یا ہمیں تنکے عزیز

ڈھونڈتا ہے آج کنجِ عافیت
دل کبھی جس کو تھے ہنگامے عزیز

حُسن تھا اس شہر کا آوارگی
اور ہمیں تھے پاؤں کے چھالے عزیز

یہ نہ قصّہ ہے نہ اندازِ بیاں
یہ مرا احوال ہے یارِ عزیز

گھر میں جی لگتا نہیں اور شہر کے
راستے لگتے نہیں اپنے عزیز

اس طرح کیا اے غبارِ دل کوئی
رقص کرتا ہے سرِ کوئے عزیز

سائے ہیں جتنے گریزاں دھوپ سے
دھوپ کو ہیں اتنے ہی سائے عزیز

یا تعلّق کچھ نہ تھا یا آپ کو
غم ہمارے ہوگئے اتنے عزیز

سامنے آتے نہیں اور خواب میں
منہ چھپا لیتے ہیں دزدانِ عزیز

آنکھ ہے یا سیر گاہِ روز و شب
وقت ہے یا جادۂ عمرِ عزیز

کیا عجب جو درد و غم رُخصت ہوئے
وہ بھی تھے آخر رسا اپنے عزیز

شام کے سائے ہیں مائل کس طرف
اور ہوائے موسمِ دل کس طرف

جا رہی ہے کس طرف بادِ بہار
اور آوازِ سلاسل کس طرف

کاش اتنا جانتے یہ راستے
کس مسافر کی ہے منزل کس طرف

دُور تک پھیلی ہوئی ہیں بستیاں
اُٹھ کے جائے بھی تو ساحل کس طرف

آ گئی تُو کس طرف شامِ فراق
رنگ پر ہے آج محفل کس طرف

کس طرف برپا ہے شورِ زندگی
سو رہے ہیں لوگ غافل کس طرف

کھل رہی ہے کس طرف سرما کی دھوپ
رنگ چہرے کا ہے مائل کس طرف

لوگ صف آرا ہیں یہ جانے بغیر
کون در پردہ ہے شامل کس طرف

کیجیے کیا رائگانی کا حساب
جوڑیے کس دن کا حاصل کس طرف

سیلِ خوں ٹھیرے تو اندازہ کریں
ہم کہاں ہیں اور ساحل کس طرف

پھاندیے دیوارِ زنداں کس طرح
پھینکیے طوق و سلاسل کس طرف

اس جہانِ دشتِ بے آثار میں
ڈھونڈیے اُس کا مماثل کس طرف

کچھ پتا چلتا نہیں کس راہ میں
کون ہے دامن کشِ دل کس طرف

سر پہ اوڑھے آبرومندی کی دھوپ
جا رہے ہیں یہ قبائل کس طرف

لے رہی ہے زندگی انگڑائیاں
ہیں پرِ پرواز مائل کس طرف

جا رہا تھا رات سطحِ آب پر
جانے اک درویشِ کامل کس طرف

ہو رہے ہیں قتل کن راہوں میں ہم
چھوڑ آئے جادۂ دل کس طرف

دیکھنا یہ ہے سرِ محفل رسا
دیکھتا ہے جانِ محفل کس طرف

○

جلنے کو چلے ہم بھی تری بزم میں لیکن
ہم سوختہ جانوں کا کہیں نام نہ آیا

کیا گماں کیا خبر
اک دھواں سا مگر

اِس فضا میں کہاں
طائرانِ شجر

کیا بساطِ ہوا
کیا چراغِ ہنر

آسماں سرنگوں
پائے طاؤس پر

اک عجب بوجھ سا
میرے اعصاب پر

کیا بنا کیجیے
اب سرِ رہگزر

راہ دِکھلا گئیں
بجلیاں کوند کر

آئینہ رکھ گئی
رات دیوار پر

کھڑکیاں کھولیے
آسماں دیکھ کر

خاک میں مل گئی
سب متاعِ ہنر

قمریاں کو بہ کو
راستے دربدر

اب کہاں ڈھونڈیے
روشنی کا شجر

مرجعِ خلق ہے
ایک تاریک گھر

قرضِ درویش کیا
ایک درویش پر

سناٹا بامِ و در سے
برسے ہے اِک پہر سے

کیا سیلِ باد و باراں
گزرے ہے آگ پر سے

اس سایہ بارِ گل کو
نسبت ہے کس شجر سے

کھینچے ہے تیغِ ابرو
گزرے ہے جب ادھر سے

وحشت کرے ہے کیا کیا
مژگانِ رہ گزر سے

بالوں کو اپنے ظالم
باندھے ہے کس ہُنر سے

ٹوٹا ہے آج کیسا
آئینہ شیشہ گر سے

ظالم کہا میں اُس کو
خلقِ خدا کے شر سے

تجھ لب سنی میں خوبی
گلہائے تازہ تر سے

○

موسم کیسا گیانی ہے
پتھر پانی پانی ہے

لہریں کیسی منگتی ہیں
ساحل کیسا دانی ہے

اس بستی کی سچّائی
اس بستی کا پانی ہے

جاتے جاتے جائے گی
برسوں کی ویرانی ہے

ہم بھی ہیں اک آوارہ
رات بھی اک دیوانی ہے

کچھ تو رستے ایسے ہیں
کچھ میری بے دھیانی ہے

آجاتی ہے سُولی پر
نیند بڑی مستانی ہے

اس خطّے میں ہم بھی ہیں
یہ خطّہ بارانی ہے

جو کچھ ہے یاں مایا ہے
مایا آنی جانی ہے

اُس کے سات سمندر ہیں
میری ایک کہانی ہے

آپ رسؔا سے واقف ہیں
میرا یار جانی ہے

ہاتھ میں خنجر آ سکتا ہے
یا پھر ساغر آ سکتا ہے

آنکھیں زخمی ہو سکتی ہیں
ذرّہ اُڑ کر آسکتا ہے

چھت کے اُوپر سونے والے
سُورج سر پر آسکتا ہے

خواب میں آنے والا اک دن
خواب سے باہر آسکتا ہے

کالا جادو کرنے والا
مشعل لے کر آسکتا ہے

سارے منظر چھپ سکتے ہیں
ایسا منظر آ سکتا ہے

شاید کوئی آنے والا
لمحہ بہتر آسکتا ہے

گھر کا رستہ بھولنے والا
چوراہے پر آ سکتا ہے

مٹی ہجرت کر سکتی ہے
دریا چل کر آ سکتا ہے

○

رات ہم نے جہاں بسر کی ہے
یہ کہانی اُسی شجر کی ہے

یہ ستارے یہاں کہاں سے آئے
یہ تو دہلیز میرے گھر کی ہے

نیند کیا کیجیۓ کہ آنکھوں میں
اک نئی جنگ خیر و شر کی ہے

میرے کچے مکان کے اندر
آج تقریبِ چشمِ تر کی ہے

ہجر کی شب گزر ہی جائے گی
یہ اُداسی تو عمر بھر کی ہے

عشق اپنی جگہ مگر ہم نے
منتخب اور ہی ڈگر کی ہے

اُٹھ رہا ہے دھواں مرے گھر میں
آگ دیوار سے اُدھر کی ہے

ہم نے اپنے وجود کی چادر
تنگ اپنے گمان پر کی ہے

وہ ستارہ شناس ایسا تھا
یا کسی نے اُسے خبر کی ہے

جا رہے ہو کدھر رسا مرزا
دیکھتے ہو ہوا کدھر کی ہے

سامنے جی سنبھال کر رکھنا
پھر وہی اپنا حال کر رکھنا

آ گئے ہو تو اس خرابے میں
اب قدم دیکھ بھال کر رکھنا

شام ہی سے برس رہی ہے رات
رنگ اپنے سنبھال کر رکھنا

عشق کارِ پیمبرانہ ہے
جس کو چھونا مثال کر رکھنا

کشت کرنا محبّتیں اور پھر
خود اُسے پائمال کر رکھنا

روز جانا اُداس گلیوں میں
روز خود کو نڈھال کر رکھنا

اس کو آتا ہے موجِ مے کی طرح
ساغرِ لب اُچھال کر رکھنا

سخت مشکل ہے آئینوں سے رسا
واہموں کو نکال کر رکھنا

O

نام جو بھی ہو نسب جو بھی ہو
تھا وہ اک شخص عجب جو بھی ہو

اس سے کہنا کہ کبھی آ کے ملے
ہم سے رنجش کا سبب جو بھی ہو

چاند نکلا ہے سرِ شاخِ گلاب
یا پسِ خیمۂ شب جو بھی ہو

مجھ میں جو شخص چھپا بیٹھا ہے
مجھ سے کہتا ہے کہ اب جو بھی ہو

رقص جاری رہے تاروں سے کہو
معرکہ آخرِ شب جو بھی ہو

مسئلہ میرا رفاقت ہے رسا
مذہبِ بنتِ عنب جو بھی ہو

○

کہاں جاتے ہیں آگے شہر جاں سے
یہ بَل کھاتے ہوئے رستے یہاں سے

وہاں اب خواب گاہیں بن گئی ہیں
اٹھے تھے آبدیدہ ہم جہاں سے

زمیں اپنی کہانی کہہ رہی ہے
الگ اندیشۂ سود و زیاں سے

انہیں بنتے بگڑتے دائروں میں
وہ چہرہ کھو گیا ہے درمیاں سے

اُٹھا لایا ہوں سارے خواب اپنے
تری یادوں کے بوسیدہ مکاں سے

میں اپنے گھر کی چھت پر سو رہا ہوں
کہ باتیں کر رہا ہوں آسماں سے

وہ ان آنکھوں کی محرابوں میں ہر شب
ستارے ٹانک جاتا ہے کہاں سے

رسؔا اس آبنائے روز و شب میں
دمکتے ہیں کنول فانوسِ جاں سے

○

عمر گزری رہ گزر کے آس پاس
رقص کرتے اُس نظر کے آس پاس

زُلف کھلتی ہے تو اُٹھتا ہے دُھواں
آبشارِ چشمِ تر کے آس پاس

کوندتی ہیں بجلیاں برسات میں
طائرِ بے بال و پر کے آس پاس

رات بھر آوارہ پتّے اور ہوا
رقص کرتے ہیں شجر کے آس پاس

چھوڑ آیا ہوں متاعِ جاں کہیں
غالباً اُس رہ گزر کے آس پاس

بال بکھرائے یہ بوڑھی چاندنی
ڈھونڈتی ہے کیا کھنڈر کے آس پاس

اُس گلی میں ایک لڑکا آج بھی
گھومتا رہتا ہے گھر کے آس پاس

ایک صورت آشنا سائے کی دھوپ
پڑ رہی ہے بام و در کے آس پاس

کیسے پُر اسرار چہرے ہیں رسؔا
خواب گاہِ شیشہ گر کے آس پاس

اب جو دیکھا تو داستان سے دُور
اُٹھ رہا تھا دھواں چٹان سے دُور

دیکھنا کیا مکان کی جانب
اب یہاں بیٹھ کر مکان سے دُور

ہجر کس آنکھ کا ستارہ ہے
رقص کرتا ہے آسمان سے دُور

جی رہا ہوں تری قلمرو میں
تیرے دل سے ترے گمان سے دُور

جانتا ہوں زمین کس کی ہے
بیٹھ جاتا ہوں سائبان سے دُور

دل وہ آتش کدہ کہ روشن ہے
شہر شیراز و شیروان سے دُور

لڑ رہا ہوں رسا قبیلہ دار
میر و مرزا کے خاندان سے دُور

تیر جیسے کمان کے آگے
موت کڑیل جوان کے آگے

بادشاہ اور فقیر دونوں تھے
شہر میں اک دکان کے آگے

چلتے چلتے زمین رُک سی گئی
ناگہاں اک مکان کے آگے

ہم بھی اپنا مجسمہ رکھ آئے
رات اندھی چٹان کے آگے

طشتِ جاں میں سجا کے رکھنا تھا
حرفِ دل میہمان کے آگے

کیا عجب شخص ہے کہ بیٹھا ہے
دھوپ میں سائبان کے آگے

ہم کسی کو گواہ کیا کرتے
اس کھلے آسمان کے آگے

کب تلک جھوٹ بولتے صاحب
اس طرح خاندان کے آگے

کون کہتا رسا خدا لگتی
ایسے کافر گمان کے آگے

○

یہ شہر بے اماں سے
یہ لوگ رائگاں سے

یہ شور مضمحل سا
یہ پیڑ نیم جاں سے

یہ عمرِ مختصر کے
انداز بے کراں سے

ہیبت زدہ سمندر
خاموش بادباں سے

جمہور دل گرفتہ
انسان بے زباں سے

امواج پابہ جولاں
ساحل رواں دواں سے

تقدیر روشنی کی
وابستہ خاکداں سے

ہر شام اک ستارہ
نکلے ہے آسماں سے

ہر شام اک جہنم
گزرے ہے درمیاں سے

آیا رسا غزل میں
آتش کدہ کہاں سے

کس طرف کوچ کر گئے سارے
کیا ہوئے روشنی کے مینارے

کون ایسا خدا کا دشمن ہے
سر پہ منڈلا رہے ہیں طیارے

ظلم کی چل رہی ہے پن چکی
عدل کے بج رہے ہیں نقارے

سوکھنے کے قریب ہے دریا
ڈوبنے کے قریب ہیں تارے

اک لڑی میں پرو دیئے کس نے
آدمی، دشت، پھول، سیارے

جانے کن جنگلوں سے در آئے
شہر تنقید میں لکڑہارے

چاند ہوتا نہیں ہر اک چہرہ
پھول ہوتے نہیں سخن سارے

کس جہنم کا رزق ہوں مرزا
کس لیے چُن رہا ہوں انگارے

○

اے خداوندِ ذوالجلال مجھے
ہو چلا ہے جنوں، سنبھال مجھے

رات اک شخص آئینہ تمثال
دے گیا اپنے خدّوخال مجھے

رات لگتی ہے خواب دریا کا
نیند سرگوشیوں کا جال مجھے

وہ ستارہ نژاد سونپ گیا
کس خرابے کی دیکھ بھال مجھے

اب کسی خواب کے دریچے سے
دیکھ اے گردِ ماہ و سال مجھے

موسموں کا مطالبہ کیا ہے
کیوں بنایا ہے یرغمال مجھے

وہ ابھی خواب تھا کہ آنکھوں نے
دیکھنا کردیا محال مجھے

ایک ایسی ہی شام تھی وہ بھی
یاد ہے طائرِ خیال مجھے

پہلے اُس نے رستا چراغ دیا
اور پھر منصبِ وصال مجھے

○

اِس گھر کی ساری دیواریں شیشے کی ہیں
لیکن اِس گھر کا مالک خود اک پتھر ہے

—

مرزا پیارے ان رستوں پر کیونکر چلتے ہو
انگاروں پر کس کے آنچل سایا کرتے ہیں

رات ہے یا ہوا مکانوں میں
جل رہا ہے دیا مکانوں میں

جانے کیا ہو گیا مکینوں کو
جانے کیا ہو گیا مکانوں میں

لوگ کن واہموں میں رہتے ہیں
کاٹتے ہیں سزا مکانوں میں

اِک ستارہ زمین پر اُترا
اور پھر کھو گیا مکانوں میں

ایسا لگتا ہے خواب کی تعبیر
دیکھتا ہے خدا مکانوں میں

ایک سائے سے روز ہوتا ہے
آمنا سامنا مکانوں میں

ان ستاروں کا مشغلہ ہے رسا
تاکنا جھانکنا مکانوں میں

کوئی تعمیر کی صورت نکالو
کوئی تازہ بِنائے عشق ڈالو

بلاتی ہیں تمھیں یادیں پُرانی
چراغِ رفتگاں فرصت نکالو

مجھے چہروں سے خوف آنے لگا ہے
مرے کمرے سے تصویریں ہٹالو

یہ دریا ہے گزر جانا ہے اس کو
مسافر ہو تم اپنا راستہ لو

کہاں اب وہ لباسِ وضعداری
بہت جانو اگر غربت چھپالو

وفا قیمت نہیں جو لوٹ آئے
تم اپنا ازسرِ نو جائزہ لو

نہیں آزارِ جاں کوئی تو مرزا
کسی دیوار کا سایہ اُٹھا لو

رُخ گھٹا کا ہے سمندر کی طرف
اور نظر سب کی مرے گھر کی طرف

چُن رہے تھے لوگ خالی سیپیاں
دیکھتے کیا دیدۂ تر کی طرف

ایک لڑکا باغ کی دیوار پر
ایک بوڑھا ہاتھ پتھر کی طرف

دو کبوتر رات کے ایوان میں
دو ستارے ایک بستر کی طرف

رقص میں ہے آج طاؤسِ خیال
پڑ رہا ہے عکس ساغر کی طرف

منتقل ہر دانۂ گندم ہوا
کھیت سے اپنے مقدّر کی طرف

دیکھتے ہیں لوگ کس موسم کے خواب
آئینے رکھ کر سمندر کی طرف

کھینچ رکھا ہے اُسی دیوار نے
دائرہ اک اور باہر کی طرف

ہم نے بھی آباد کُنجِ دل کیا
راہ میں سرو و صنوبر کی طرف

اُن لبوں کو لکھ دیا ہوگا گلاب
دھیان ہوگا مصرعۂ تر کی طرف

ایک لمحے کا سفر ہے زندگی
اپنے پس منظر سے منظر کی طرف

ہم نے کس شہرِ سخن آباد میں
گھر بنایا میرؔ کے گھر کی طرف

مہرباں ہو فن کی دیوی تو رساؔ
چل کے آتی ہے سخنور کی طرف

اپنی بے چہرگی میں پتھر تھا
آئینہ بخت میں سکندر تھا

رات بے جادۂ ستارہ تھی
چاند بے حجلۂ پیمبر تھا

سرگزشتِ ہوا میں لکھا ہے
آسماں ریت کا سمندر تھا

کس کی تصنیف ہے کتابِ دل
کون تالیف پر مقرر تھا

کچھ تو واضح نہ تھی تری صورت
اور کچھ آئینہ مکدّر تھا

وہ نظر خضرِ راہ مقتل تھی
اُس سے آگے مرا مقدّر تھا

رات آغوشِ دیدۂ تر میں
عکسِ آغوشِ دیدۂ تر تھا

یہ قدم اُس گلی کے لگتے ہیں
جس گلی میں کبھی مرا گھر تھا

○

کچھ نہ کچھ سوچتے رہا کیجے
آسماں دیکھتے رہا کیجے

چار دیوارئ عناصر میں
کودتے پھاندتے رہا کیجے

اس تحیّر کے قید خانے میں
انگلیاں کاٹتے رہا کیجے

کھڑکیاں بے سبب نہیں ہوتیں
تاکتے جھانکتے رہا کیجے

راستے خواب بھی دکھاتے ہیں
نیند میں جاگتے رہا کیجے

فصل ایسی نہیں جوانی کی
دیکھتے بھالتے رہا کیجے

آئینے بے جہت نہیں ہوتے
عکس پہچانتے رہا کیجے

زندگی اس طرح نہیں کٹتی
وقت اندازتے رہا کیجے

ناسپاسانِ علم کے سر پر
پگڑیاں باندھتے رہا کیجے

○

ہم چلے جاتے ہیں یا پھر شام کو
ملنے آجاتے ہیں یارانِ عزیز

روز آکر گلے سے لگتے ہیں
خواب پھر بھی نئے سے لگتے ہیں

زندگی فلسفہ سا لگتی ہے
آپ جب سوچنے سے لگتے ہیں

چال اپنی جگہ ستاروں کے
دیکھنے میں بھلے سے لگتے ہیں

شہر سایہ زدہ سا لگتا ہے
راستے اژدھے سے لگتے ہیں

سوچیے تو خیال کے اطراف
آئینے گھومنے سے لگتے ہیں

اِک طرف کائنات کے اَسرار
ہاتھ باندھے ہوئے سے لگتے ہیں

وقت آموختہ سا لگتا ہے
اور ہم بھولنے سے لگتے ہیں

اور اب اس غزل سرائی میں
روز و شب قافیے سے لگتے ہیں

اُن ستارہ نژاد آنکھوں میں
اپنے ہی رتجگے سے لگتے ہیں

ان دنوں شہر جاں میں آئے ہوئے
یاد کے طائفے سے لگتے ہیں

شعر ہم نے نئے رسا تیرے
واقعی اُن کہے سے لگتے ہیں

○

عشق کا منصب مِلا جس کو مِلا
میرا کیا ہے میں تو اک مزدور تھا

رشتۂ جسم و جاں بھی ہوتا ہے
ٹوٹنے کا گماں بھی ہوتا ہے

اس توہم کے کارخانے میں
کارِ شیشہ گراں بھی ہوتا ہے

ہم سے عزلت نشیں بھی ہوتے ہیں
عرصۂ لامکاں بھی ہوتا ہے

ہم بھی ہوتے ہیں اُس کی محفل میں
رقصِ سیّارگاں بھی ہوتا ہے

بادِ صحرائے جاں بھی ہوتی ہے
نغمۂ سارباں بھی ہوتا ہے

جوئے آبِ رواں بھی ہوتی ہے
عکسِ سروِ رواں بھی ہوتا ہے

پھول کھلتے بھی ہیں سرِ مژگاں
چاندنی کا سماں بھی ہوتا ہے

لوگ مل کر بچھڑ بھی جاتے ہیں
اور یہ ناگہاں بھی ہوتا ہے

چشمِ آئینہ ساز میں شاید
آئینہ کا گماں بھی ہوتا ہے

○

ہے لیکن اجنبی ایسا نہیں ہے
وہ چہرہ جو ابھی دیکھا نہیں ہے

بہر صورت ہے ہر صورت اضافی
نظر آتا ہے جو ویسا نہیں ہے

اِسے کہتے ہیں اندوہِ معانی
لبِ نغمہ گلِ نغمہ نہیں ہے

لہو میں میرے گردش کر رہا ہے
ابھی وہ حرف جو لکھا نہیں ہے

ہجومِ تشنگاں ہے اور دریا
سمجھتا ہے کوئی پیاسا نہیں ہے

عجب میرا قبیلہ ہے کہ جس میں
کوئی میرے قبیلے کا نہیں ہے

جہاں تم ہو وہاں سایہ ہے میرا
جہاں میں ہوں وہاں سایہ نہیں ہے

سرِ دامانِ صحرا کھل رہا ہے
مگر وہ پھول جو میرا نہیں ہے

مجھے وہ شخص زندہ کر گیا ہے
جسے خود اپنا اندازہ نہیں ہے

محبت میں رسا کھویا ہی کیا تھا
جو یہ کہتے کہ کچھ پایا نہیں ہے

ساقی ارباب ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

کتب برقی

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

میرؔ جی سے اگر ارادت ہے
قولِ ناسخ کی کیا ضرورت ہے

کون پوچھے یہ میرؔ صاحب سے
ان دنوں کیا جنوں کی صورت ہے

چاند کس مہ جبیں کا پرتو ہے
رات کس زُلف کی حکایت ہے

کیا ہوائے بہارِ تازہ ہے
کیا چراغِ سرائے عبرت ہے

زندگی کس شجر کا سایہ ہے
موت کس دشت کی مسافت ہے

آگ میں کیا گُلِ معانی ہیں
خاک میں کیا نمو کی صورت ہے

کیا پسِ پردۂ توہم ہے
کیا سرِ پردۂ حقیقت ہے

اس کہانی کا مرکزی کردار
آدمی ہے کہ آدمیّت ہے

کاٹتا ہوں پہاڑ سے دن رات
مسئلہ عشق ہے کہ اُجرت ہے

پھر محبت کا فلسفہ کیا ہے
یہ اگر سب لہو کی وحشت ہے

ایک تو جاں گسل ہے تنہائی
اُس پہ ہمسائیگی قیامت ہے

اور جیسے اُسے نہیں معلوم
شہر میں کیا ہماری عزت ہے

اُس نے کیسے سمجھ لیا کہ مجھے
خواب میں جاگنے کی عادت ہے

گھر سے شاید نکل پڑے وہ بھی
آج کچھ دھوپ میں تمازت ہے

ہم یونہی مبتلا سے رہتے ہیں
یا کسی آنکھ کی مروّت ہے

میرؔ بولے سنو رساؔ مرزا
عشق تو آج بھی صداقت ہے

اس جہانِ بلند و پست کے بیچ
کچھ اگر ہے تو اپنا قامت ہے

○

موج در موج چلے جاتے ہیں
دل ہی اپنا ہے نہ دریا اپنا

ہم ہیں منزل کہ نشانِ منزل
کیا ہے اس وقت سے رشتہ اپنا

میرا اِک چھوٹا سا گھر ہے
گھر کے اندر ایک شجر ہے

ایک شجر ہے جس کا سایہ
ننگے پاؤں ننگے سر ہے

میرا تعاقب کرنے والی
اک انجانی راہ گزر ہے

ہر دامن ہے وقت کا دامن
ہر دامن میں گردِ سفر ہے

اس بستی کے لوگ ہیں کیسے
پوچھ رہے ہیں کون نگر ہے

سچ کا زہر پیا ہے کس نے
کہنے کو اک بات مگر ہے

میرے بچے پھول سے بچے
کن شانوں پر میرا سر ہے

سامنے گھر ابھی نہیں آیا
ایسا منظر ابھی نہیں آیا

زخمِ دل کے ابھی نہیں مہکے
وہ گُلِ تر ابھی نہیں آیا

دَورِ تشنہ لبی نہیں گزرا
دَورِ ساغر ابھی نہیں آیا

سامنے ہے درخت بیری کا
اور پتھّر ابھی نہیں آیا

یا ابھی بادباں نہیں کھولے
یا سمندر ابھی نہیں آیا

خیر تو ہے کہ آج اس گھر سے
کوئی پتھّر ابھی نہیں آیا

لوٹ آئے طیورِ آوارہ
اور رسؔا گھر ابھی نہیں آیا

میں جس دل میں مکیں ہوں گھر ہے میرا
محبت بوریا بستر ہے میرا

پڑی ہے کشتِ جاں بے آب کب سے
کنایہ تجھ سے چشمِ تر ہے میرا

مری آنکھوں میں ہیں سب خواب میرے
مری آنکھوں میں پس منظر ہے میرا

مری اقلیم، اقلیمِ سخن ہے
مرا فرمان شعرِ تر ہے میرا

کوئی کہہ دے حریفانِ غزل سے
غزل کیا ہے، یہ دردِ سر ہے میرا

مجھے تنہا نہ سمجھو میرے پیچھے
خدائے افضل و برتر ہے میرا

طلب کرتے ہیں مجھ سے حرف میرے
رسا وہ قرض جو مجھ پر ہے میرا

جسم بدلے گا جان بدلے گا
وہ مرا ہر گمان بدلے گا

ایک کردار ہے کہانی کا
جو کہیں درمیان بدلے گا

وہ اچانک کہیں سے آئے گا
اور مری داستان بدلے گا

اک سمندر نژاد آوارہ
خار و خس کا جہان بدلے گا

یا زمیں اپنا بوجھ بدلے گی
یا شجر سائبان بدلے گا

سب سیاق و سباق بدلیں گے
یا فقط آسمان بدلے گا

یا وہ کوئی دلیل لائے گا
یا پھر اپنا بیان بدلے گا

ایسا لگتا ہے یہ کرایہ دار
منہ اندھیرے مکان بدلے گا

جانے کب اُس کی یاد آئے گی
جانے کب میرا دھیان بدلے گا

○

اُس کو تشویش داستاں میں تھی
اور لکنت مری زباں میں تھی

ایک لپکا سا دھڑکنوں میں تھا
ایک وحشت سی جسم و جاں میں تھی

ایک کوندا سا آنسوؤں میں تھا
ایک کھڑکی سی آسماں میں تھی

اُس کے شوکیس میں کھلونے تھے
نیند پلکوں کے سائباں میں تھی

پینگیں لیتا ہوا بدن اُس کا
اور دیوار درمیاں میں تھی

میں ہلاکِ خدنگِ قامت تھا
ایک قوسِ قزح کماں میں تھی

سانپ لپٹے ہوئے تھے شاخوں سے
اک عجب لہر گلستاں میں تھی

ایک بستی سوائی مادھوپور
حلقہ ہائے پری وشاں میں تھی

چاند کے ہاتھ میں کٹورا تھا
چاندنی دستِ خاکداں میں تھی

میں ابھی تک اُسی مکاں میں ہوں
میری تصویر جس مکاں میں تھی

اور اب اِک خلیج حائل ہے
پہلے دیوار درمیاں میں تھی

وہ بھی سب کی نظر میں آئے گا
اور جو کچھ شجر میں آئے گا

بوجھ سر پر اُٹھائے سورج کا
کون اس دوپہر میں آئے گا

اُس پہ معنی کھلیں گے قامت کے
جب حصارِ نظر میں آئے گا

کیا خبر تھی چراغِ زخمِ ہنر
دستِ دریوزہ گر میں آئے گا

وہ میری اہمیت کو سمجھے گا
اب جو اس رہ گزر میں آئے گا

ہر قدم اک نئی جہت ہوگی
ہر ستارہ سفر میں آئے گا

عکس اپنے وجود سے پہلے
حجلۂ شیشہ گر میں آئے گا

شور پتّوں کی سرسراہٹ کا
خواب گاہِ سحر میں آئے گا

چور دل کا کسی دریچے سے
ایک دن چشمِ تر میں آئے گا

گر یہی روز و شب رہے پیارے
کون پھر اس نگر میں آئے گا

○

چاندنی رات اور لبِ دریا
ڈھونڈتا ہے مجھے مرا سایہ

اُس نے رکھا ہمیں شب آوارہ
ہم نے مصروف چاند کو رکھا

سوچتا ہوں کھڑا ہوا چھت پر
چاند کس زاویئے سے نکلے گا

اُس کو دیکھا ہے بارہا لیکن
آج دیکھا ہے خواب اَن دیکھا

اس خرابے کی سمت آتے ہوئے
کس کو دیکھا ہے راستے کے سوا

میرے قصے سنایا کرتا ہے
میرے بچوں کو پیڑ کا سایہ

آخرِ شب ہے اور ایسے میں
میرے لب پر کوئی دعا نہ گلہ

یا کبھی حادثات بے معنی
یا کبھی بات بات پر گریہ

خاک اُڑنے لگی ہے آنکھوں میں
نیند کرنے لگا ہے سنّاٹا

لوگ مصروف ہوگئے کتنے
شہر ویران ہوگیا کیسا

دینے والے رفاقتوں کی بھیک
مانگتے ہیں رفاقتوں کا صلہ

میری قاتل ہے میری تنہائی
میرا یہ وہم مجھ کو مار گیا

چُھپ کے بیٹھا ہوں قرض خواہوں سے
کررہا ہوں حساب دُنیا کا

پیش اُس کے چلی نہ عیّاری
رہ گیا شجرۂ نسب رکھا

جوئے آبِ رواں تری بانہیں
تیری انگڑائی موڑ دریا کا

بِچ لگنے لگی دکانِ دل
کیسا گاہک دکان میں آیا

کس قدر خود فریب ہوں میں بھی
کس قدر دل فریب ہے دُنیا

ایک چہرے کے ہیں یہ سب چہرے
اور کسی سے کوئی نہیں ملتا

دیکھتا ہے گلوب کے اطراف
پاؤں رکھ کر گلوب پر بچّہ

○

نہ اب ہم سا کوئی پیاسا ملے گا
نہ اب آگے کوئی دریا ملے گا

نہ اب ایسی متاعِ غم ملے گی
نہ ایسا بانٹنے والا ملے گا

نہ گھبرا رات تیرے دن پھریں گے
تجھے اک چاند سا بیٹا ملے گا

مرے پیروں تلے دنیا ملے گی
ردائے فقر میں مولا ملے گا

یہاں سورج ملے گا سر جھکائے
یہاں اُلٹا ہوا کاسہ ملے گا

مرے ہاتھوں کو بوسہ دینے والے
تجھے حرفِ دمِ عیسیٰ ملے گا

پسِ الفاظ آئینے ملیں گے
پسِ آئینہ اک چہرہ ملے گا

کبھی شہرِ وفا آنکھوں سے اوجھل
کبھی سروِ چراغاں سا ملے گا

مری دہلیز پر ہمزاد میرا
دریچوں میں مرا چہرہ ملے گا

یہاں کچھ پیڑ ایسے بھی ملیں گے
جہاں آسیب کا سایہ ملے گا

یہاں ہر شخص اپنی خلوتوں میں
سرِ کوہِ انا بیٹھا ملے گا

سوائے وقت کی بے چہرگی کے
تمہیں ان آئینوں میں کیا ملے گا

کہیں دیوار کے رشتے ملیں گے
کہیں دیوار کا جھگڑا ملے گا

گزر جائیں گے بادل بستیوں سے
تو دریا بستیوں سے آ ملے گا

تجھے اک دن گروہِ قاتلاں میں
ترے ہی جسم کا سایا ملے گا

ابھی تو دن کی زنجیریں کٹی ہیں
ابھی تو چاند کا ہالا ملے گا

چلو اِس بھیڑ ہی میں چل کے دیکھیں
کہیں تو راہ گم کردہ ملے گا

اُٹھو اب رات کا پچھلا پہر ہے
وہ ایسے میں ابھی تنہا ملے گا

رساؔ اس عشق کے جمہوریے میں
ہر اک درویش شہزادہ ملے گا

○

محبت خبط ہے یا وسوسہ ہے
مگر اپنی جگہ یہ واقعہ ہے

جسے ہم واہمہ سمجھے ہوئے ہیں
وہ سایہ بھی تری دیوار کا ہے

ہوا نے تاک رکھا ہے شجر کو
پرندہ شاخ پر بیٹھا ہوا ہے

مکاں سرگوشیوں سے گونجتے ہیں
اندھیرا روزنوں سے جھانکتا ہے

در و دیوار چپ سادھے ہوئے ہیں
فقط اک عالمِ ہُو بولتا ہے

مری آنکھوں پہ عینک دوسری ہے
کہ یہ تصویر کا رُخ دوسرا ہے

سنا ہے ڈوبنے والے نے پہلے
کسی کا نام ساحل پر لکھا ہے

گذر کس کا ہوا ہے جو ابھی تک
دو عالم آئینہ بردار سا ہے

یہ دنیا مٹ گئی ہوتی کبھی کی
مگر اک نام ایسا آ گیا ہے

محبت ہے رتسا میری عبادت
یہ سناٹا مرا دست دعا ہے

○

بڑھنے دیتے ہیں نہ خود بڑھتے ہیں
لمحے زنجیر بنے بیٹھے ہیں

رات کیا سوچ رہا تھا میں بھی
اپنے عالم کا خدا تھا میں بھی

وہ بھی کچھ خود سے الگ تھا جیسے
اپنے سائے سے جُدا تھا میں بھی

وہ بھی تھا اک ورقِ سادہ کتاب
حرفِ بے صوت و صدا تھا میں بھی

صورتِ شاخِ ثمردار تھا وہ
صورتِ دستِ صبا تھا میں بھی

وہ بھی اک حلقۂ گرداب میں تھا
اور بس ڈوب چلا تھا میں بھی

پھول کھلنے کا عجب موسم تھا
آئینہ دیکھ رہا تھا میں بھی

ایک راہِ خیال پر تنہا
میں اِدھر اور وہ اُدھر تنہا

سوچتے ہیں وہ کیوں نہیں ہوتا
آ، کہ سوچیں یہ بیٹھ کر تنہا

ہم نے دیکھے ہیں شام کے سائے
ہم نے کاٹی ہے دوپہر تنہا

زندگی اور اس قدر مصروف
آدمی اور اس قدر تنہا

خواب اپنے تھے وادیاں اپنی
یہ نکل آئے ہم کدھر تنہا

بس یہیں تک ہے قصۂ درویش
اس سے آگے ہے اب سفر تنہا

پھر وہی دھوپ پھر وہی سائے
بستی بستی، نگر نگر تنہا

پھر وہی موسمِ شجر کاری
پھر وہی شاخِ بے ثمر تنہا

خواب تھا وہ کہ جل رہا تھا رات
بیچ دریا میں کوئی گھر تنہا

کس بھری دوپہر میں بیٹھا ہے
راہ میں سایۂ شجر تنہا

انقلابات ہیں زمانے کے
ورنہ تم اور میرے گھر تنہا

○

کوئی درد آشنا نہیں نہ سہی
درد تو ہے، دوا نہیں، نہ سہی

رات یوں بھی گزر ہی جائے گی
دھڑکنوں کی صدا نہیں، نہ سہی

پوچھتے ہیں متاعِ درد کا مول
کوئی دیکھے تو گاہکوں کے ٹھٹھول

پیار ہم نے کیا ہے تیرے نال
اک یہی ہے سند ہمارے کول

ہم بھی آخر ترے دعا گو ہیں
ہم فقیروں سے بھی کبھی ہنس بول

راستے سے گذر گئے دونوں
وہ تہی دست میں تہی کشکول

دُور کوہِ ندا پہ اک آواز
اور سڑکوں پہ بھیڑیوں کے غول

دیکھ یہ لوگ کچھ الگ سے ہیں
ان کو میزانِ عام پر مت تول

تیری آواز میں تجھے دیکھوں
رنگ اپنے سماعتوں میں گھول

گونجتے ہیں ہنوز یادوں میں
تیری آنکھوں کے اَن کہے دو بول

گھر کے اندر مُہیب سناٹا
اور باہر منادیوں کے ڈھول

یا توازن عدم توازن ہے
یا کہیں رہ گیا ہے کوئی جھول

○

سر اُٹھاتا ہے چراغِ دل تو جل جاتی ہے شام
کھینچتا ہوں دامنِ دل تو نکل جاتی ہے شام

غازۂ رخسار کی صورت مہک اُٹھتی ہے دھوپ
دیکھ کر کُنجِ لبِ جاناں مچل جاتی ہے شام

روز در آتا ہے کوئی روزنِ دیوار سے
یا مرے کمرے کی تصویریں بدل جاتی ہے شام

ایک سایہ سا اُبھرتا ہے فضا میں اور پھر
شہر کی آوارہ سڑکوں پر نکل جاتی ہے شام

آسرے پر شام کے مرتا ہے دن بھر آدمی
اور سنبھلنے بھی نہیں پاتا کہ ڈھل جاتی ہے شام

ڈھیر کر جاتی ہے مجھ کو اور پھر اُس ڈھیر میں
رکھ کے کچھ چنگاریاں آگے نکل جاتی ہے شام

یہ سنہرے کھیت دریا، شہر، جنگل، وادیاں
ایک پَل میں سینکڑوں منظر بدل جاتی ہے شام

راکھ ہو جاتا ہے سورج آپ اپنی آگ میں
اور چوبِ خشک کی مانند جل جاتی ہے شام

تتلیوں کے پیچھے پیچھے جیسے بچّے کا خیال
دُور بستی سے کسی جانب نکل جاتی ہے شام

شہر کراچی یاد ہے تجھ کو تیرے شب بیداروں میں
مرزا رسا چغتائی بھی تھا یار ہمارا یاروں میں

ان گلیوں ان بازاروں کی نوک پلک کے متوالے
کیسے کیسے لوگ تھے جن کے نام چھپے اخباروں میں

کس پہ کتابِ دل اُتری اور کس نے اسمِ عشق پڑھا
کس نے یہاں بسرام کیا ان حرف و صوت کے غاروں میں

نوکِ سناں کی صورت دیکھے رات کو ہم بنے تارے بھی
رات کو ہم نے چاند بھی دیکھا تیرے پہرے داروں میں

اس بستی کے پس منظر میں دُور تلک دیواریں ہیں
اور کسی نے چُن رکھے ہیں سائے ان دیواروں میں

اور طنابِ خیمۂ شب کو کھینچ کے باندھو لفظوں سے
اور گھٹن کو موسم لکھو شاہوں کے درباروں میں

کیسا ہیجان ہے سمندر میں
چاند مہمان ہے مرے گھر میں

میری پلکوں کی دسترس سے دُور
تیری تصویر ہے سمندر میں

جگمگاتے ہوئے کلس جیسے
کوئی مندر ہو بیچ ساگر میں

رقص کرنے لگی ہے ٹائپ پر
تیرے قدموں کی چاپ دفتر میں

لکھنے والے ہوا کا پس منظر
پڑ گئے کس ہَوا کے چکّر میں

آج پہچانتا نہیں کوئی
میری آواز سے مرے گھر میں

میں ہوا کی طرح اکیلا ہوں
وقت کے اس کھلے سمندر میں

چوٹیوں کے عذاب لکھے ہیں
دامنِ کوہ کے مقدر میں

○

رات آنکھوں میں ہو بسر کیوں کر
دن گزاریں اِدھر اُدھر کیوں کر

شام ہوتے ہی لَوٹ آتے ہیں
طائرانِ شجر کیوں کر

سانس لیتی ہے زندگی کیسے
راہ چلتی ہے رہ گزر کیوں کر

جبرِ فطرت نہ ہو تو کیوں سوچے
آدمی خوں کرے جگر کیوں کر

حرف آواز بن گئے کیسے
حرف لکھنا ہوا ہنر کیوں کر

جنگ کیسی ہوا سے ہے اب کے
بے سپر ہو گئے شجر کیوں کر

چل رہا ہے سفینۂ ہستی
بادبانِ خیال پر کیوں کر

میرے دل کو سمجھ لیا تو نے
خانہ آباد اپنا گھر کیوں کر

خواب اپنی زمین کے لکھیے
دامنِ ابرو باد پر کیوں کر

○

صبا غنچوں کو شاید چھو گئی ہے
ابھی اک موجِ رنگ و بو گئی ہے

—

موجۂ درد لے اڑی ورنہ
میں بھی پتھر کا ہو گیا ہوتا

جانے کیا دیدۂ تر لے آئے
اور گواہی میں سحر لے آئے

میں نے زلفوں کی مہک مانگی تھی
لوگ شاخِ گل تر لے آئے

رن پڑا کوچۂ قاتل میں تو لوگ
سامنے اپنے سپر لے آئے

پھر جو لوٹے تو قبیلے والے
اپنے سردار کا سر لے آئے

پھر اُسے لوٹ کے آنا پڑ جائے
اور یہی راہ گزر لے آئے

وہ پتا بھول گیا ہے شاید
کوئی اُس کو مرے گھر لے آئے

میں یہ کہتا ہوں کہ تاریخ بشر
پھر کوئی ایسا بشر لے آئے

راہ جو تیرے گھر کو جاتی ہے
تیرے گھر سے کدھر کو جاتی ہے

آبنائے خیال میں جیسے
کوئی کشتی سفر کو جاتی ہے

دیکھ کر دار کے تسلسل میں
یہ کہانی کدھر کو جاتی ہے

جانے والے کدھر کو جاتے ہیں
رہگزر رہگزر کو جاتی ہے

لوگ اپنی خبر کو جاتے ہیں
موت اپنی خبر کو جاتی ہے

آہ، کہ جاتی ہے یہ جوانی بھی
اور پھر عمر بھر کو جاتی ہے

تیری آہٹ سنائی دیتی ہے
پھر نہ جانے کدھر کو جاتی ہے

وہ خدا کو خدا ہی کہتا ہے
یہ بھی عظمت بشر کو جاتی ہے

○

کیسی آہٹ رگِ جاں سے آئی
روشنی کس کے مکاں سے آئی

ایسا لگتا ہے سیاہِ مژگاں
پھر کسی قریۂ جاں سے آئی

زندگی تیری روایت ہم تک
نغمۂ آبِ رواں سے آئی

گھر کا مفہوم کہاں سے آیا
گھر میں دیوار کہاں سے آئی

زندگی کے سراب بھی دیکھوں
نیند آئے تو خواب بھی دیکھوں

رات کاٹوں کسی خرابے میں
منہ اندھیرے گلاب بھی دیکھوں

حرفِ تازہ ورق ورق لکھوں
سادہ دل کی کتاب بھی دیکھوں

ڈوب جاؤں کسی سمندر میں
پھر جزیروں کے خواب بھی دیکھوں

زندگی میں حماقتیں بھی کروں
اس کا پھر سدِّباب بھی دیکھوں

آج دل کی بیاض میں لکھ کر
لفظ خانہ خراب بھی دیکھوں

پیاس دل کی بجھاؤں آنکھوں سے
رقص کرتے حباب بھی دیکھوں

○

پڑھ رہا ہوں کتاب آنکھوں میں
لکھ رہا ہوں شراب آنکھوں میں

آج سمجھے حجاب کے معنیٰ
آج دیکھا حجاب آنکھوں میں

آج دل کی کتاب کا اُس نے
پڑھ لیا انتساب آنکھوں میں

کر رہی تھی زمیں قدم بوسی
کھل رہے تھے گلاب آنکھوں میں

اور پھر ہم نے رتجگے دیکھے
ایک دن خواب آنکھوں میں

اور پھر خود کو ڈوبتے دیکھا
اُن سمندر سراب آنکھوں میں

کوئی خانہ خراب ہی ہوگا
ایسی خانہ خراب آنکھوں میں

آج بے باق کر دیا سارا
دوستوں نے حساب آنکھوں میں

تیرے بھیجے ہوئے نہ بھیجے ہوئے
درج ہیں سب عذاب آنکھوں میں

○

کیا لکھوں، ہے باعثِ تحریر کیا
خواب کیا اور خواب کی تعبیر کیا

اک جہاں آباد ہے زیرِ زمیں
ہے طلسمِ حسرتِ تعمیر کیا

عشق ہے پابستۂ زنجیر کیوں
زلف سے ہے رشتۂ زنجیر کیا

دیکھ لیتے آپ کی تصویر کو
کھینچ لیتے آپ کی تصویر کیا

اک یہی کشتِ زمینِ شعر ہے
اور ہماری میرؔ کی جاگیر کیا

○

چاند دیکھوں کہ سمندر دیکھوں
یا ترے دل میں اُتر کر دیکھوں

چاندنی رات کا منظر دیکھوں
یا سکوتِ لبِ ساغر دیکھوں

روز یادوں کے صنم خانے میں
کون رکھ جاتا ہے پتّھر دیکھوں

کون آتا ہے یہاں رات گئے
آج دیوار گرا کر دیکھوں

اپنی قسمت کا ستارہ دیکھا
اب ستارے کا مقدر دیکھوں

اب جو دیکھوں تو کبھی عالمِ ذات
عرصۂ ذات سے باہر دیکھوں

○

ہر چیز سے ماورا خدا ہے
دنیا کا عجیب سلسلہ ہے

کیا آئے نظر کہ راستوں میں
صدیوں کا غبار اُڑ رہا ہے

جتنی کہ قریب تر ہے دنیا
اتنا ہی طویل فاصلہ ہے

الفاظ میں بند ہیں معانی
عنوانِ کتابِ دل کھُلا ہے

کانٹوں میں گلاب کھِل رہے ہیں
ذہنوں میں الاؤ جل رہا ہے

○

تم کو میری یاد آئے گی، آئے گی پچھتانا ہوگا
لیکن ایسا کیوں کر ہوگا، ہوگا بھی تو اب کیا ہوگا

اُس دم میرے ان اشکوں کی یہ سوندھی خوشبو مہکے گی
ہلکی ہلکی بارش میں جب کوئی تنہا تنہا ہوگا

نکہتِ گل کا نغمہ ہو یا دل کے دھڑکنے کی آہٹ ہو
سننے والے سن ہی لیں گے شہر میں جب سناٹا ہوگا

دَور گیا تلوار کے فن کا فنِ سخن کی بات کریں اب
آپ مغل ہیں مرزا صاحب جوہر تو دکھلانا ہوگا

جام بولیں گے سُبو بولے گا
تشنہ کاموں کا لہو بولے گا

ہم نہ بولیں گے سرِ بزم تو کیا
آپ وہ آئینہ رُو بولے گا

یہ تو سوچا بھی نہ تھا جانِ بہار
پھول مہکیں گے نہ تُو بولے گا

زخم بولیں گے نہ ہم بولیں گے
تیرا اندازِ رفو بولے گا

اب نہ بولے گا کوئی آج کے بعد
خنجرِ زیبِ گلو بولے گا

ایسا لگتا ہے کہ کچھ دیر میں اب
اس بھرے شہر میں ہُو بولے گا

اُس نے تقسیم کر دیا سب کچھ
اور پھر بھی رہا خدا سب کچھ

چھوڑ آئے ہیں شہر میں تیرے
اک تری یاد کے سوا سب کچھ

تیرے اپنے سوا ترے گھر میں
ہے خدا کا دیا ہوا سب کچھ

کام لے ان لبوں سے اب کچھ اور
صرف ہوتی نہیں دعا سب کچھ

گھونسلے کے قریب اک چڑیا
سوچ میں ہے، یہ کیا ہوا سب کچھ

جسم و جاں کے بھی کچھ تقاضے ہیں
عشق تنہا نہیں رسا سب کچھ

اس سے پہلے کہ گھر نظر آئے
وہ کسی موڑ پر نظر آئے

یاد ہوں تو کوئی حوالہ دوں
خواب تو عمر بھر نظر آئے

کوئی چہرہ نظر نہیں آیا
آئینے دربدر نظر آئے

میں نہ جانے کہاں بھٹک جاؤں
تُو نہ جانے کدھر نظر آئے

راہ میں دو چراغ رکھے ہوئے
اُس کو ہر موڑ پر نظر آئے

آج چلتے رہیں یونہی دونوں
جب تلک رہگزر نظر آئے

ان فلک بوس منزلوں کے بیچ
صرف دیوار و در نظر آئے

اپنی یادوں کے آسمان تلے
سائے ملنے لگے زمیں سے گلے

گھر میں دھونی رمائے بیٹھا ہوں
اپنے چہرے پہ اپنی خاک ملے

کوئی موسم نہیں محبت کا
چاند اُبھرے کہ آفتاب ڈھلے

دیکھتا ہے ہزار آنکھوں سے
آسماں کیا ردائے شب کے تلے

جانے کیوں ساحلِ سمندر پر
بجھنے لگتا ہے دل چراغ جلے

لے اڑی پھر کسی خیال کی رَو
گھر میں بیٹھے ہوئے تھے اچھے بھلے

چارۂ کار عجز قبول نہیں
ایسے الزام آ پڑے ہیں گلے

لوگ اِن پھوس کے مکانوں میں
چاہتے ہیں کوئی الاؤ جلے

○

ہیں سربستہ اگرچہ راز میرے
ستارے ہیں مگر غمّاز میرے

الگ ہیں سوچ کے انداز میرے
الگ ہیں گیت میرے ساز میرے

مری گم گشتگی میرا پتہ ہے
مری ایجاد ہیں اعزاز میرے

دمِ پرواز دم بھرتے ہیں میرا
حریفِ شعلۂ آواز میرے

بازیٔ جاں بساط پر ہے یہاں
آج نقشہ ہی کچھ دگر ہے یہاں

چال اُس کی جسے سجھائی دے
کھیل موقوف چال پر ہے یہاں

خوب بازارِ قصّہ خوانی ہے
سب کو درپیش اک سفر ہے یہاں

راستے کس لیے اُلجھتے ہیں
کون سا میرا اپنا گھر ہے یہاں

کیسے زندہ ہیں اِس گلی کے لوگ
راہ چلنا بھی اک ہُنر ہے یہاں

چار دیواریٔ عناصر میں
لوگ کہتے ہیں اک شجر ہے یہاں

ایسا لگتا ہے آئینہ کوئی
درمیانِ دل و نظر ہے یہاں

تمام رشتۂ عیب و ہنر سے لکھے ہیں
یہ میرے حرف یہ میرے گواہ سچے ہیں

زمیں کو میری گواہی میں کون لایا ہے
زمیں کے ہاتھ پہ کس نے چراغ رکھے ہیں

یہ کون رخشِ ہوا پر سوار آیا ہے
پسِ غبار یہ کیا آئینے سے رکھے ہیں

یہ روز کس کے تعاقب میں گھر سے جاتا ہوں
یہ روز نت نئے چہرے کہاں سے آتے ہیں

اُداسیوں کا سبب کوئی ہو تو بتلائیں
کہ ہم اُداس کبھی بے سبب بھی رہتے ہیں

سگانِ شہر سے کوئی گلہ نہیں ہم کو
اب ان سے کیا کہیں تیری گلی کے بچے ہیں

نہ اب کے رنگ ہی پھوٹے ہیں میرے کھیتوں سے
نہ اب کے سَیل ہی مرغابیوں کے آئے ہیں

ماں کی ہیں دعائیں ساتھ میرے
ترکے پہ گزارا کر رہا ہوں

لپٹا ہوں یہ کس کی خاکِ پا سے
تسخیرِ ستارہ کر رہا ہوں

پیروں سے زمیں نہیں لگی ہے
ساحل سے کنارہ کر رہا ہوں

پیڑوں سے قبائیں چھن رہی ہیں
موسم کا نظارہ کر رہا ہوں

چلمن سے نظارہ ہو رہا ہے
کھڑکی سے اشارہ کر رہا ہوں

○

سیکھا ہے ابھی تو پاؤں چلنا
چلنے کا ارادہ کر رہا ہوں

نکل کر سایۂ ابرِ رواں سے
رہے ہم مدّتوں بے سائباں سے

زمیں پر چاند آیا چاہتا ہے
اُتر کر کشتیٔ آبِ رواں سے

نگاہیں ڈھونڈتی ہیں رفتگاں کو
ستارے ٹوٹتے ہیں آسماں سے

مناتے خیر کیا ہم جسم و جاں کی
اُسے چاہا تھا ہم نے جسم و جاں سے

رسا کس عہدِ ناپُرساں میں ہم نے
لیا ہے کام حرفِ رائگاں سے

○

صرف مانع تھی حیا بندِ قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

پاس اپنے اک جان ہے سائیں
باقی یہ دیوان ہے سائیں

جس کا کوئی مول نہ گاہک
کیسی یہ دوکان ہے سائیں

آنسو اور پلک تک آئے
آنسو اگنی بان ہے سائیں

جوگی سے اور جگ کی باتیں
جوگی کا ایمان ہے سائیں

میں جھوٹا تو دُنیا جھوٹی
میرا یہ ایمان ہے سائیں

جیسا ہوں جس حال میں ہوں میں
اللہ کا احسان ہے سائیں

رہنا ہر دم بجھا بجھا سا کچھ
ہو گیا دل کا مشغلہ سا کچھ

تیری زلفوں کا میری وحشت کا
ملتا جلتا ہے سلسلہ سا کچھ

ہم سے ملنے کو اِک زمانہ ملا
تیرا ملنا تھا سانحہ سا کچھ

ایسا اُجڑا صنم کدہ دل کا
ہو گیا خانۂ خدا سا کچھ

دل کے صحرا میں آ نکلتا ہے
اب بھی کوئی گریز پا سا کچھ

لطفِ دیوانگی نہیں آیا
بزم میں لوگ تھے شناسا کچھ

شام سے پہلے گھر گئے ہوتے
یا سرِ شام مر گئے ہوتے

اس گدایانہ زندگی سے تو
وضعدارانہ مر گئے ہوتے

یوں بھی اک عمر رائگاں گزری
یوں بھی کچھ دن گزر گئے ہوتے

تُو جو دل سے اُتر گیا ہوتا
زخم دل کے اُبھر گئے ہوتے

ہم نہ ہوتے تو حادثاتِ جہاں
جانے کس کس کے سر گئے ہوتے

کوئی دامن کش خیال نہ تھا
ورنہ ہم بھی ٹھہر گئے ہوتے

شمعِ محفل نہ تھے کہ محفل میں
لے کے ہم زخمِ سر گئے ہوتے

تیرے آنے کا انتظار رہا
عمر بھر موسمِ بہار رہا

پا بہ زنجیر زلفِ یار رہی
دل اسیرِ خیالِ یار رہا

ساتھ اپنے غموں کی دھوپ رہی
ساتھ اِک سروِ سایہ دار رہا

میں پریشان حال آشفتہ
صورتِ رنگِ روزگار رہا

آئینہ آئینہ رہا پھر بھی
لاکھ دَر پردۂ غُبار رہا

کب ہوائیں تہِ کمند آئیں
کب نگاہوں پہ اختیار رہا

تجھ سے ملنے کو بیقرار تھا دل
تجھ سے مل کر بھی بیقرار رہا

کل یونہی تیرا تذکرہ نکلا
پھر جو یادوں کا سلسلہ نکلا

لوگ کب کب کے آشنا نکلے
وقت کتنا گریز پا نکلا

عشق میں بھی سیاستیں نکلیں
قربتوں میں بھی فاصلہ نکلا

رات بھی آج بیکراں نکلی
چاند بھی آج غمزدہ نکلا

سنتے آئے تھے قصۂ مجنوں
اب جو دیکھا تو واقعہ نکلا

ہم نے مانا وہ بے وفا ہی سہی
کیا کرو گے جو باوفا نکلا

مختصر تھیں فراق کی گھڑیاں
پھیر لیکن حساب کا نکلا

جس کو چاہا وہی صنم ٹھیرا
جس کو پُوجا وہی خدا نکلا

اپنا سایا سمجھ رہا تھا جسے
وہ مرا بختِ نارسا نکلا

○

کرن پھوٹے گی پھر اُس کُنجِ لب سے
کہ روشن صبح کے امکان ہوں گے

ہمارے شعر دہرائے گی دنیا
ہم اپنے دَور کی پہچان ہوں گے

کہاں رُکتی ہے دریا کی روانی
جو آنسو تھم گئے طوفان ہوں گے

میں نے سوچا تھا اس اجنبی شہر میں زندگی چلتے پھرتے گزر جائے گی
یہ مگر کیا خبر تھی تعاقب میں ہے ایک نادیدہ زنجیرِ ہمسائیگی

یہ درختوں کے سائے جو چپ چاپ ہیں ہم محبت زدوں کے یہ ہمراز ہیں
اب یہیں دیکھنا رات پچھلے پہر دو دھڑکتے دلوں کی صدا آئے گی

غم کا سورج ڈھلا درد کا چاند بھی، بجھ چلے آنسوؤں کے دیئے آج بھی
اور اسی سوچ میں اب سحر آئے گی، اب سحر آئے گی، اب سحر آئے گی

لاکھ پھولوں پہ پہرے بٹھاتے رہیں لاکھ اونچی فصیلیں اُٹھاتے رہیں
جائے گی سُوئے گلزار جب بھی صبا اپنی آوازِ زنجیرِ پا جائے گی

روشنی شمع کی خود گلوگیر ہے، ہنسنا تہذیب ہے، جلنا تقدیر ہے
وہ مگر قطرۂ اشکِ شبنم جسے صبح کی سب سے پہلی کرن پائے گی

ہے وفا شرطِ محبت تو تقاضا کیسا
میری خاموش نگاہی کو وہ سمجھا کیسا

پا کے اُس بزم گہِ ناز میں تنہا خود کو
تُو نے محسوس کیا ہے دلِ زندہ کیسا

تیشۂ وقت نے ہر کوہِ گراں کاٹ دیا
جاں سے لپٹا ہے مگر درد کا رشتہ کیسا

وہ جو اِک شخص مرے ساتھ چلا تھا گھر سے
راہ میں چھوڑ گیا ہے مجھے تنہا کیسا

آج کس اوٹ سے نکلا یہ تری یاد کا چاند
روشنی کا ہے مرے گھر میں یہ ہالا کیسا

اور پھر شہر نے دیکھا کہ سرِ دشتِ وفا
ابر یادوں کا تری ٹوٹ کے برسا کیسا

کچھ خانماں برباد تو سائے میں کھڑے ہیں
اِس دَور کے انسان سے یہ پیڑ بڑے ہیں

پتّھر ہیں تو رستے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے
رہرو ہیں تو کیوں صورتِ دیوار کھڑے ہیں

چیونٹی کی طرح رینگتے لمحوں کو نہ دیکھو
اے ہمسفر و رات ہے اور کوس کڑے ہیں

میں ہیچ مداں ہیچ سخن، ہیچ عبارت
کہتا ہوں تو کہتے ہیں کہ الفاظ بڑے ہیں

تاریخ بتائے گی کہ ہم اہلِ قلم ہی
آزادیٔ انساں کے لیے جنگ لڑے ہیں

زندگی شعلہ فشاں گزری ہے
اور لبِ آبِ رواں گزری ہے

مسکراتی ہوئی اک شوخ کرن
میری جانب نگراں گزری ہے

کہہ رہی ہوں وہ نگاہیں جیسے
اجنبی رات کہاں گزری ہے

آخرِ شب وہ ستاروں کی پھوار
شیشۂ دل پہ گراں گزری ہے

اک لجائی ہوئی پرچھائیں سی
برسرِ راہِ گماں گزری ہے

ہائے کس خشک زباں سے پتّے
کہہ رہے ہیں کہ خزاں گزری ہے

چاندنی تھی کہ ترے جسم کی آنچ
رات کس درجہ تپاں گزری ہے

میں تو آزردۂ وحشت ہوں مگر
تم پہ کیا اہلِ جہاں گزری ہے

قلبِ گردوں سے مری آہ رسا
صورتِ کاہکشاں گزری ہے

○

چراغِ صبح سے شامِ وطن کی بات کرو
جو راہ میں ہے ابھی، اُس کرن کی بات کرو

درِ قفس پہ جو آئے صبا تو پھر پہروں
بٹھا کے سامنے گل پیرہن کی بات کرو

جہاں سے ٹوٹ گیا سلسلہ خیالوں کا
وہاں سے زلفِ شکن در شکن کی بات کرو

مہکے گی کہیں زلف تو دھڑکے گا کہیں دل
آوارگئ شوق کے ساماں ہی رہیں گے

یہ بات الگ ہے کہ دبے پاؤں گزر جائیں
لمحات مگر سلسلہ جنباں ہی رہیں گے

محسوس ہوا یہ کہ اب اس صحنِ چمن میں
جو پھول کھلیں گے وہ پریشاں ہی رہیں گے

کھلتے ہی رہیں گے سرِ مژگانِ وفا پھول
ہم شعلہ بجاں شعلہ بداماں ہی رہیں گے

اُگتا ہی رہے گا در و دیوار سے سبزہ
آثارِ جنوں گھر سے نمایاں ہی رہیں گے

آجا کہ یہ کم فرصتئ شوق بہت ہے
کچھ اور نہیں وعدہ و پیماں ہی رہیں گے

تشنگانِ عشق لب تشنہ ملے
کیسے کیسے بیکراں دریا ملے

گل کھلیں یا زخمِ دل اب کے برس
دیکھئے سوغاتِ موسم کیا ملے

کیا پتہ اپنا بتائیں ہم اُسے
یوں اگر وہ شخص ہمسایہ ملے

زندگی کے یہ جھمیلے اور ہم
سوچتے ہیں وہ کبھی تنہا ملے

شہر میں جائیں تو لوگوں کا ہجوم
اور گھر جائیں تو سناٹا ملے

میں یہاں تنہا کھڑا ہوں، آبِ جو
کہنا گر آگے کوئی پیاسا ملے

عکسِ زلفِ رواں نہیں جاتا
دل سے غم کا دھواں نہیں جاتا

چاندنی کے حسین چہرے سے
داغِ بے خانماں نہیں جاتا

مژدۂ نو بہار سنتے ہیں
خونِ دل رائگاں نہیں جاتا

سُن اے منّت کشِ صدائے جرس
اس طرف کارواں نہیں جاتا

موتیوں سا وہ آب آب بدن
وصل کا وہ سماں نہیں جاتا

کوئی موضوعِ گفتگو ہو رسا
اپنا حسنِ بیاں نہیں جاتا

یاد آئے بھی تو اب وہ لب و رخسار کہاں
ہم کہاں، عشق کہاں وقت کی رفتار کہاں

کیا کہیں پاسِ غریب الوطنی ہے ورنہ
سایۂ زلف کہاں سایۂ دیوار کہاں

یہ جو تصویر سی آئینۂ الفاظ میں ہے
تیری صورت ہے مگر صورتِ اظہار کہاں

اک عذابِ دل و جاں ہے مری غمخواری بھی
جانتے ہیں مجھے لیکن مرے غم خوار کہاں

یہ سرابِ غمِ ہستی ہے کہ صحرائے خیال
ہم نکل آئے فسونِ نگۂ یار کہاں

مجھ کو غالبؔ نہ کہو، میں نہیں غالب لیکن
وہ سخن فہم کہاں ہیں وہ طرفدار کہاں

جو گھٹا اُمنڈ کے آئی ہے وہ برس نہ لے تو یہ کیا کُھلے
کہ زمینِ دل کی بھڑاس ابھی ہے دبی ہوئی کہ نکل گئی

جسے دیکھیے وہ تہی سبو سرِ بزم ہے یہی گفتگو
جو شراب ہم نے کشید کی وہ کدھر گئی کہاں ڈھل گئی

میں قتیلِ تیغِ جفا ہوا چلو قرضِ جاں ہی ادا ہوا
کہو یہ مگر تمھیں کیا ہوا جو یہ رسمِ شہر میں چل گئی

میں غریبِ شہرِ غزل مجھے یہی سوچ ہے، یہی فکر ہے
مری سوچ کیا، مری فکر کیا، اگر آبروئے غزل گئی

○

عمر گزری روتے لیکن ایسا سناٹا نہ تھا
میں نہ تھا کل رات یا وہ میرا ہمسایہ نہ تھا

موج یوں آئی کہ آئی اور کنارہ کش ہوئی
جیسے کوئی تشنہ لب، تشنہ لبِ دریا نہ تھا

وہ تو کہیے ہم ہی کچھ دامن کشِ دنیا رہے
ورنہ کاروبارِ دنیا میں کوئی گھاٹا نہ تھا

رات کچھ آج شبنمی سی ہے
مسندِ گل بجی ہوئی سی ہے

آرزو کے حسین خوابوں کی
چاندنی بھی لُٹی ہوئی سی ہے

اُن کی پلکوں پہ کہکشاں کی لکیر
دُور تک ایک روشنی سی ہے

آپ نے دل کی دھڑکنوں کو سنا
ان میں کچھ راگ راگنی سی ہے

رقص کرتی ہوئی تہہِ گرداب
ایک یادوں کی جل پری سی ہے

راہرو بھی ہیں نیند کے ماتے
راہ بھی کچھ تھکی تھکی سی ہے

یہ نشاطِ بدن کہ رگ رگ میں
ایک موجِ سپردگی سی ہے

ان دہکتے ہوئے پیالوں میں
جانے کیا چیز چاندنی سی ہے

پھر سرِ راہِ انتظار رسا
کوئی آہٹ دبی دبی سی ہے

○

نہ دل انگیز تیرا غم ہی ایسا
نہ اَبرو باد کا موسم ہی ایسا

نہ ایسا رنگِ رخسارِ چمن ہی
نہ رنگِ دیدۂ شبنم ہی ایسا

مجھے ہی شکوۂ تشنہ لبی ہے
کہ میرے جام میں ہے سم ہی ایسا

جسے محسوس اب تم کر رہے ہو
بہت دن سے ہے کچھ عالم ہی ایسا

اس تکلف سے آج دل دھڑکا
جیسے شرما کے کوئی پھول کھلا

گھنی پلکوں کے نرم سائے میں
نیند ہی نیند ہے نشہ ہی نشہ

یہ تصور میں کون آیا ہے!
ہمہ شادابی و ہمہ نغمہ

مہکے مہکے سے عارضوں کے کنول
بھکی بھکی سی چاندنی کی فضا

کوئی امکانِ بازگشت نہیں
ایسی کھوئی ہے زندگی کی صدا

ہم بھی اُن منزلوں کے جویا ہیں
جن کا کوئی نشان ہے نہ پتہ

ذکرِ فردوس ہے کہ اے واعظ
داستانِ طلسمِ ہوش رُبا

اے دلِ نغمہ سرا
کوئی ہنگامہ اُٹھا

دن ڈھلا شام ہوئی
کوئی آنسو نہ دیا

یہ سلگتا ہوا دل
اور یہ سرد ہوا

جانے کس سوچ میں ہوں
جانے کیا بھول گیا

دستِ گلچیں میں کلی
پابہ زنجیر صبا

پھول سے جسم پہ اور
اس قدر تنگ قبا

آپ تو بھول گئے
ہم سے یہ بھی نہ ہوا

رات تھی بیت گئی
چاند تھا ڈوب گیا

○

پھر جو اُس راہ گزر سے گزرے
اجنبی لوگ نظر سے گزرے

پھر نہ آئی جرسِ دل کی صدا
قافلے لاکھ اِدھر سے گزرے

بارہا ہم پہ قیامت گزری
بارہا ہم ترے در سے گزرے

تھک کے بیٹھا تھا سرِ راہِ خیال
ناگہاں آپ اِدھر سے گزرے

زمیں کا بوجھ ہے اس سر پہ آسماں کی طرح
مجھے سمجھ نہ مرے جسمِ ناتواں کی طرح

بہت دنوں میں یہ عقدہ کھلا کہ میں بھی ہوں
فنا کی راہ میں اک نقشِ جاوداں کی طرح

شراب خانۂ دل میں یہ کس کی یاد آئی
خیالِ خاطرِ یارانِ تشنگاں کی طرح

وہ دل نواز تو ہو جس پہ جاں نثار کریں
ہو امتحانِ محبّت تو امتحاں کی طرح

ہوئی ہے تم سے ملاقات پر نہ جانے کہاں
خیال و خواب کی صورت کہ جسم و جاں کی طرح

ہوئے رسا نہ ہوئے مرزا محتشم علی بیگ
وگرنہ ہوتے تجمل حسین خاں کی طرح

آنکھ سے پھر اک آنسو ٹپکا اور پھر اک جگ بیت گیا
لیکن تیری یاد کا سایہ اب بھی گہرا گہرا ہے

جیون رستے ہنستے بستے پلک جھپکتے دُھول ہوئے
شہر جہاں آباد تھا پہلے آج وہاں سنّاٹا ہے

صحرا صحرا خاک اُڑاتا قیس پھرا، دیوانہ تھا
جس بستی میں ہم ہیں اُس کا کوچہ کوچہ صحرا ہے

آگ پرائی ہو یا اپنی جلنا کیا دانائی ہے
لیکن دل نادان ہے ایسا جانتا ہے پھر جلتا ہے

چوتھی سمت کے جانے والے شہزادو اک بات سنو
گیسو گیسو زنجیریں ہیں پلکوں پلکوں پہرا ہے

○

کچھ اور بیٹھتے کچھ اور جی بہل جاتا
بس اتنی دیر ذرا چاند اور ڈھل جاتا

لگا لیا ہے یہ کیا روگ اُن نگاہوں نے
میں راہرو تھا مرا کیا، کہیں نکل جاتا

لرز رہا ہے اُفق پر جو اِک ستارہ سا
یہی جبیں پہ کسی کے اگر مچل جاتا

سحر کے غم میں جو آنسو بہائے ہیں ہم نے
ان آنسوؤں سے تو اِک آفتاب ڈھل جاتا

○

ہم نے تو اس عشق میں یارو کھینچے ہیں آزار بہت
تم کچھ اس کی بات کرو ہے جس سے تم کو پیار بہت

لوگ ہم ایسے نادانوں کو آئیں گے سمجھانے بھی
تیرا غم پھر تیرا غم ہے غم ہے تو غم خوار بہت

آئے موسمِ گُل، دیکھیں وہ کس کس کو زنجیر کریں
اب کے سنا ہے اہلِ چمن بھی بیٹھے ہیں بیزار بہت

ان کو بے حس جان نہ ساقی اوّلِ شب ہے بادہ نوش
رات ڈھلے محسوس کریں گے شیشے کی جھنکار بہت

اپنا اپنا حُسنِ نظر ہے اپنی اپنی منزل ہے
شرط میسر آنا ہے تو سایۂ زلفِ یار بہت

بہت دنوں سے کوئی حادثہ نہیں گزرا
کہیں زمانے کو ہم یاد پھر نہ آجائیں

جگر کے زخموں کو غنچوں سے کیوں کریں تعبیر
خزاں نصیب بہاروں کے گیت کیوں گائیں

کوئی تو پوچھنے والا بھی آ ہی نکلے گا
چلو کہ شہر کی گلیوں سے سر کو ٹکرائیں

یہ جام اور یہ بھرپور چاندنی کا شباب
بس آج آپ مرے راستے سے ہٹ جائیں

بہت سی باتوں کا خود بھی یقیں نہ آئے ہمیں
جو آج گزرے ہوئے واقعات دہرائیں

جنہیں خود اپنے غموں سے نہیں مفر وہ رسا
کہاں سے چاند ستاروں کا درد اپنائیں

تیشۂ آہ دل شکن بھی نہیں
شہرِ خوباں میں قدرِ فن بھی نہیں

لُٹ رہی ہے متاعِ صبر و سکوں
راہ میں کوئی راہزن بھی نہیں

اب کسے حسنِ رنگ و بُو کہیے
چاندنی گردِ پیرہن بھی نہیں

میکدہ ہے کہ آفتاب بکف
میرے ساغر میں اک کرن بھی نہیں

میری مشاطگیٔ فن کے لیے!
تیری زلفوں میں اک شکن بھی نہیں

میں ہوں وہ شمعِ انجمن کہ رسا
زینتِ طاقِ انجمن بھی نہیں

حُسن بزمِ مثال میں کیا ہے
آئینے کے خیال میں کیا ہے

دیکھتی کیا ہے اے نگاہِ کرم
میرے دستِ سوال میں کیا ہے

تُو نہیں ہے تو کون ہے مجھ میں
فرق ہجر و وصال میں کیا ہے

انقلاباتِ زندگی کیا ہیں
گردشِ ماہ و سال میں کیا ہے

آپ دامن کشاں گزرتے ہیں
رہگزارِ خیال میں کیا ہے

بات اظہارِ حال میں کیا تھی
راز اخفائے حال میں کیا ہے

آدمی سمجھتا ہے زندگی کی قیمت کیا
مل گئی تو جنّت ہے اور وہ بھی جنّت کیا

گاہکوں کی فطرت ہے گاہکوں سے حجّت کیا
جسم کی تجارت میں جان کی رعایت کیا

یہ زمیں نہ جانے کس دستِ کوزہ گر میں ہے
اک جہاں ہے گردش میں آب و گل کی قسمت کیا

چُن رہا ہوں پلکوں سے راستے کے کانٹوں کو
قرضِ آدمیّت ہے فرضِ آدمیّت کیا

○

پھول ہو کہ پتّھر ہو اشک ہو کہ شبنم ہو
زندگی کے یہ عنواں ہو چکے رقم یارو

جذبۂ پرستش پھر جذبۂ پرستش ہے
ہم تراش ہی لیں گے اک نہ اک صنم یارو

خود سے حسنِ خود نگر ناآشنا
اور دیوانوں سے دنیا آشنا

لفظ تو اک صورتِ اظہار ہے
آشنا کیا اور کیا ناآشنا

کیا ہوئی اے ساکنانِ شہرِ دل
وہ صدائے درد صحرا آشنا

یاد ہے کچھ سایۂ دیوارِ دوست
کوئی ایسا شخص بھی تھا آشنا

ہر نفس ہے ماتم تعبیرِ خواب
زندگی ہے خوابِ فردا آشنا

ایک آنسو بھی سرِ مژگاں نہیں
بول اے دیوارِ دریا آشنا

ساتھ کسی کا ہم کیا دیتے
کب تک خود کو دھوکا دیتے

جانے دنیا کیا کیا کہتی
جانے تم کیا طعنہ دیتے

کیا ہے رسمِ دنیا داری
دیوانوں کو سمجھا دیتے

کام نہ تھا اُس شہر میں کوئی
اُن گلیوں میں پہرا دیتے

آنے والے ہر لمحے کو
اشکوں کا نذرانہ دیتے

اُن آنکھوں نے باتیں کی ہیں
اُن آنکھوں کو بوسہ دیتے

خار اگائے، خار سمیٹو
پیڑ اگاتے، سایہ دیتے

دل کہ تھا دردِ آشنا تنہا
جل بجھا اک چراغ تھا تنہا

تجھ سے کیا کیا ہمیں اُمیدیں تھیں
تو بھی آئی ہے کیا صبا تنہا

ایسے ہنگامۂ تصوّر میں
ہم سے ملتے بھی آپ کیا تنہا

رات کی بیکراں خموشی میں
گیت بنتی رہی ہوا تنہا

یہ تو اپنا شعار ہے ورنہ
کون کرتا ہے یوں وفا تنہا

دشت سا دشتِ زندگی ہے رسا
پھر رہا ہوں غبار سا تنہا

○

مائل بہ کرم کب نگۂ ناز نہیں تھی
تجھ کو ہی سلیقہ دلِ ناکام نہ آیا

بے اثر ہے، اثرِ نالہ و فریاد ابھی
قسمتِ سنگ میں ہے تیشۂ فرہاد ابھی

سلسلے درد کے جتنے بھی تھے سب ٹوٹ گئے
اُن سے محکم ہے مگر رشتۂ بیداد ابھی

ہمصفیروں کی جدائی نے انہیں قید کیا
وہ اسیرانِ قفس جو ہوئے آزاد ابھی

اس محبت سے سرِ بزم ہر اک سمت نہ دیکھ
کیا خبر، ہو کوئی لب تشنۂ فریاد ابھی

زندگی ہم نے بہر طور گزاری اے دوست
کچھ مگر ایسے سلیقے سے کہ ہے یاد ابھی

قرضِ ناخن ہے کہ صدیوں سے چلا آتا ہے
آدمیّت کہ ہے زخمِ دلِ اجداد ابھی

پالکی میں نہیں کاروں میں سہی اتراتے
پھرتے ہیں شہر میں بن شاہ کے استاد ابھی

یاد تو ہوگا تجھے عشق وہ پہلا پہلا
میں اسی بزم کا اک جام ہوں چھلکا چھلکا

دُور پلکوں کی منڈیروں پہ ترے شہر سے دُور
ایک آنسو کہ سلگتا رہا تنہا تنہا

ریگِ صحرا سے نہ اُٹھتا کوئی خورشید بھی کیا
ہم نے کیا خاک اُڑائی یونہی صحرا صحرا

بزمِ احساس کہ بے رنگ تھی اک مدّت سے
راگ چھیڑا تو سہی وقت نے دھیما دھیما

اب چلے ہو تو رسؔا جانبِ منزل ہی چلو
کوچۂ عشق کہ مدّت سے ہے سُونا سُونا

○

یاد کچھ ہو تو بھول جائیں اُسے
حال یہ ہو تو کیا سُنائیں اُسے

اس لیے بھی نہیں کہ دولتِ غم
مل گئی ہے تو یوں گنوائیں اُسے

چھاؤں میں گیسوؤں کی مہکے تھے
داغ دل کے رہے کنول برسوں

زندگی صرف ایک پل ہے مگر
خوں رُلاتا ہے ایک پل برسوں

فیصلے وقت کے اٹل ہی سہی
کیا رہیں گے یونہی اٹل برسوں

جاں گدازیٔ عشق ہے آخر
اب جلی ہے تو شمع جل برسوں

ہم خراباتیوں سے پھر ملنا
اس خرابے کی راہ چل برسوں

نیند سی نیند تھی اُن آنکھوں میں
ادھ کھلے سے رہے کنول برسوں

زُلف کو کہکشاں کیا ہم نے
کارِ شیشہ گراں کیا ہم نے

روشناسِ جہاں کیا ہم نے
حسن کو جاوداں کیا ہم نے

زندگی بھر رہے ہم آوارہ
عشقِ زلفِ رواں کیا ہم نے

دو گھڑی کو شباب آیا تھا
وہ بھی نذرِ فغاں کیا ہم نے

اس کے معنی تو یہ ہیں صبحِ بہار
خونِ دل رائگاں کیا ہم نے

وہ بھی آزردۂ خزاں نکلے
جن سے ذکرِ خزاں کیا ہم نے

جب بھی تیری یادوں کا سلسلہ سا چلتا ہے
اِک چراغ بجھتا ہے اِک چراغ جلتا ہے

شرط غمگساری ہے ورنہ یوں تو سایہ بھی
دُور دُور رہتا ہے ساتھ ساتھ چلتا ہے

سوچتا ہوں آخر کیوں روشنی نہیں ہوتی
داغ بھی ابھرتے ہیں چاند بھی نکلتا ہے

کیسے کیسے ہنگامے اُٹھ کے رہ گئے دل میں
کچھ پتہ مگر ان کا آنسوؤں سے چلتا ہے

وہ سرودِ کیف آگیں سوزِ غم جسے کہیے
زندگی کے نغموں میں ڈھلتے ڈھلتے ڈھلتا ہے

○

بے طور جاں گنوا دی خود آپ ہم نے ورنہ
کیا تم سے ناز اُٹھتے دل ایسے سرگراں کے

خُوبُو سے تیری آخر ہم بھی تو آشنا ہیں
جانے سنا رہی ہے قصّے صبا کہاں کے

ہر اک درویش کا قصہ الگ ہے
مگر طرزِ بیاں اپنا الگ ہے

غنیمت ہے بہم مل بیٹھنا بھی
اگرچہ وصل کا لمحہ الگ ہے

ملے تھے کب جو ہم اب پھر ملیں گے
ہمارا آپ کا رستہ الگ ہے

عبارت ہے شعورِ زندگی سے
نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا الگ ہے

نہیں ہے اور وابستہ ہے سب سے
ہمارے درد کا رشتہ الگ ہے

○

میں اور اس موسم میں اے پروردگار
شہر میں پیاسا پھروں دیوانہ وار

تُو نے بندوں پر اُتاری ہے وحی
ہو سکے تو آج مے خانہ اُتار

ممکن ہے وہ دن آئے کہ دنیا مجھے سمجھے
لازم نہیں ہر شخص ہی اچھا مجھے سمجھے

ہے کوئی یہاں شہر میں ایسا کہ جسے میں
اپنا نہ کہوں اور وہ اپنا مجھے سمجھے

ہر چند مرے ساتھ رہے اہلِ بصیرت
کچھ اہلِ بصیرت تھے کہ تنہا مجھے سمجھے

میں آج سرِ آتشِ نمرود کھڑا ہوں
اب دیکھیے یہ خلقِ خدا کیا مجھے سمجھے

○

افلاس کی تہمت سے گزر کیوں نہیں جاتے
مرنا ہے جب اِک روز تو مر کیوں نہیں جاتے

ٹکتے نہیں جب پاؤں زمیں پر تو فضا میں
ذرّوں کی طرح لوگ بکھر کیوں نہیں جاتے

ہم کون رسا آپ سے یہ پوچھنے والے
جاتے ہیں جدھر لوگ اُدھر کیوں نہیں جاتے

لوگ پہنچے فصل کے امکان تک
ہم وہیں ہیں کھیت سے کھلیان تک

دیکھئے کیا مزدِ جاں ٹھیرے کہ اب
عشق بھی ہے طبعِ کے میلان تک

میں پیمبر تو نہیں لیکن مجھے
حق پہنچتا ہے مرے عرفان تک

○

بندِ قبائے گل کی صورت کھُلے ہوئے ہیں
ان زخم ہائے دل کو کس نے رفو کیا ہے؟

اُس تک غزل نہ پہنچی اک عمر جس کی خاطر
ہم نے دل و جگر کو کیا کیا لہو کیا ہے

یوں چھوڑ کر ہمیں اب تنہا بجھا بجھا سا
کس سمت کا ارادہ اے شمع رُو کیا ہے

تیرے سوا بھی ہم نے اے پیکرِ معانی
سجدہ کیا ہے لیکن پیشِ سبو کیا ہے

گل کو پیغمبرِ شب کہتا ہوں
شب سے مفہوم خزاں ہے میرا

دُور افتادۂ گلشن ہوں میں
ہمنوا برگِ خزاں ہے میرا

اب مرے سامنے ہے شمعِ غزل
اب یہ دورِ گزراں ہے میرا

شعر ہے معجزۂ فکرِ رسا
حُسن اندازِ بیاں ہے میرا

ہر ہر قدم پہ سایۂ زنجیر دیکھ کر
ہم خوش ہیں اپنے خواب کی تعبیر دیکھ کر

تھے کیسے کیسے لوگ جو مل کر بچھڑ گئے
یاد آئے آج آپ کی تصویر دیکھ کر

پھر آج سوئے راہِ بُتاں دیکھتے چلو
شاید کہ ہو کوئی نگراں، دیکھتے چلو

شانوں پہ اپنے زلف پریشاں کیے ہوئے
مل جائے وہ نہ جانے کہاں دیکھتے چلو

گزرو چمن سے صورتِ آوارۂ چمن
کتنے ہیں تم سے شعلہ بجاں دیکھتے چلو

ہو تار تار دیکھیے کب تک ردائے شب
عریاں ہو بنتِ صبح کہاں دیکھتے چلو

سنتے ہیں شہرِ حُسن میں بے دام ان دنوں
بکتی ہے دل سی جنسِ گراں، دیکھتے چلو

پھر اس کے بعد رات کے سائے ہیں بیکراں
کچھ دیر کا ہے یہ بھی سماں، دیکھتے چلو

ناآشنائے درد کہ دنیا کہیں جسے
ہے کارگاہِ شیشہ گراں، دیکھتے چلو

وہ جو زنداں کو گلستاں کر چلے
سرزنش کرنے اُنہیں پتّھر چلے

ہم بھی اب کس مقتلِ احساس میں
فکرِ موضوعِ غزل لے کر چلے

کاہشِ عرضِ ہُنر ہے اور ہم
دوستوں سے کیا کہیں کیوں مر چلے

میکدے میں ہم سخن کوئی تو ہو
گفتگو کچھ تو پئے ساغر چلے

ہم تہی دامن گلوں سے کیا کہیں
کس طرح ہم ان کے دامن بھر چلے

○

کچھ تو ہے انہیں ہجر کی راتوں سے تعلق
کچھ تو تری زلفوں کے بکھرنے کا سبب ہے

پابستگی رسم و رہِ عشق ہے ورنہ
مقصد مرا آوارگی پہلے تھا نہ اب ہے

ضروری ہے خیالِ رفتگاں بھی
بڑی شے ہے غبارِ کارواں بھی

نہ دے الزامِ بدمستی کہ ساقی
اُبھر آتی ہیں اکثر تلخیاں بھی

وہاں ہیں آج انساں کی نگاہیں
جہاں ہے گردِ منزل کہکشاں بھی

عجب ہے رونقِ ویرانۂ دل
کہاں ملتی ہیں ایسی بستیاں بھی

اک افسانہ سا ہو کر رہ گئے ہیں
رہے تھے کچھ دنوں ہم سرگراں بھی

○

حالِ دل پوچھتے ہو، کیا تم نے
ہوتے دیکھا ہے دل اُداس کہیں

رسمساہٹیں ہیں یا جسم کا ترنّم ہے
چاندنی حمائل ہے زندگی کی بانہوں میں

نقش و نگارِ شہرِ دلِ زار دیکھنے
تم بھی چلو کہ آئے ہیں اغیار دیکھنے

تو میری خامشی پہ نہ جا آج بزم میں
بیٹھے ہیں لوگ جرأتِ گفتار دیکھنے

آئے ہیں ہم بھی نقدِ دل و جاں لئے ہوئے
یہ اور بات گرمیٔ بازار دیکھنے

کچھ کم نہیں یہ رشتۂ رسمِ تکلّفات
وہ آئیں حال پوچھنے، غم خوار دیکھنے

○

حُسن اک چاندنی کا دریا ہے!
اور ہر نقش اک کنول جیسے

آہٹیں سُن رہا ہوں یادوں کی
آج بھی اپنے انتظار میں گُم

کتنی یادیں جھانک رہی ہیں
ان اشکوں کے بام و در سے

اُس ایک عالمِ رنگیں کا انتظار نہ پوچھ
جس انتظار میں عالم ہزار گزرے ہیں

کیا ہے حسن کا تخلیق اِک جہاں ہم نے
ہم اپنے وقت کے پَروردگار گزرے ہیں

سنا ہے اب کے نسیمِ بہار کے جھونکے
مزاجِ اہلِ گلستاں پہ بار گزرے ہیں

ہجومِ گردشِ لیل و نہار کی سوگند
ترے بغیر بھی لیل و نہار گزرے ہیں

○

کون دل کی زباں سمجھتا ہے
دل مگر یہ کہاں سمجھتا ہے

میں رات چُور تھا نشّے میں اور نہ جانے کہاں
مگر وہ شخص کہ جس نے ترا حوالہ دیا

ہم سے پابندیٔ آدابِ قفس
چاہتا ہے تو گرفتار نہ کر

سر پہ انسانیت کا تاج بھی ہے
عشق کا اپنا اک مزاج بھی ہے

میں تجھے دیکھ کر پریشاں ہوں
میرے پیشِ نظر سماج بھی ہے

فاصلے بھی ہیں قربتیں بھی ہیں
دردِ سر بھی ہے اختلاج بھی ہے

میرے نغموں کی گم شدہ آواز
سُن سکو تو فضا میں آج بھی ہے

کچھ ترے جسم کے ترنّم میں
میرے شعروں کا امتزاج بھی ہے

○

یُوں اُسے طبعِ بدگماں دیکھیں
مر نہ جائیں جو ناگہاں دیکھیں

چاند کا خواب دیکھنے والے
چاندنی رات کا سماں دیکھیں

تجھ کو دیکھیں کہ جاں نثار ترے
حاصلِ عمرِ رائگاں دیکھیں

اب یہی ہے کہ تجھ کو یاد کریں
اور بس سوئے آسماں دیکھیں

○

ایک آنسو ایک لمحہ ایک خواب
ہم ہیں اور گرتی ہوئی دیوارِ شب

کون فریادی ہے یہ مشعل بدست
کس کی یہ جرأت سرِ دربارِ شب

کیا یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں
کون ہے پھر یہ پسِ دیوارِ شب

داغ ہائے دل وہی ہیں آج بھی
اور وہی ہے رونقِ گلزارِ شب

دیکھتے ہیں جاگتے لمحوں کے خواب
کچھ ستارے ہیں ابھی غم خوارِ شب

میں نہ تھا اور وہ گھر آیا تھا
ہائے کیا خواب نظر آیا تھا

سب ہی آئے تھے تری محفل سے
کون بادیدۂ تر آیا تھا

قصّۂ راہ گزر تھا کوئی
جو سرِ راہ گزر آیا تھا

مختصر یہ کہ ترے کوچے سے
میں تو خاموش گزر آیا تھا

کیا ستم ہے غمِ جاناں اب تو
عشق کرنے کا ہنر آیا تھا

○

شہر میں جیسے کوئی آسیب ہے
شہر میں مدّت سے ہنگامہ نہیں

صحرائے بے خیال میں جل تھل کہاں کے ہیں
آخر ہوائے شوق یہ بادل کہاں کے ہیں

زلف سے کاہکشاں تک پہنچے
سلسلے غم کے کہاں تک پہنچے

دل دھڑکتا ہے سرِ راہِ خیال
اب یہ آواز جہاں تک پہنچے

لے کے زلفوں کی اچھوتی خوشبو
کوئی جھونکا ہی یہاں تک پہنچے

تھے نہاں سینۂ شبنم میں جو راز
ہم سے پھولوں کی زباں تک پہنچے

دشت و گلشن کی کوئی قید نہیں
موجۂ گل ہے جہاں تک پہنچے

ہائے وہ نغمہ سرایانِ چمن
رفتہ رفتہ جو فغاں تک پہنچے

آئینہ ہو تو انہیں دکھلاؤں
دل کے جذبات کہاں تک پہنچے

کیوں نہ محسوس کریں اہلِ نظر
بات کیوں دل کی زباں تک پہنچے

O

زُلف مرکز سے ہٹے
ابر بَرسے تو چھٹے

رات زنجیر نہیں
اور کاٹے نہ کٹے

کوئی قصّہ ہی کہو
دوستو رات کٹے

منزلیں آپ بڑھیں
جب نگہبان ہٹے

اب جو ہونا ہے رسؔا
ہو رہے پاپ کٹے

آوارہ میری طرح اگرچہ صبا بھی ہے
لیکن وہ تیرے جسم کی لمس آشنا بھی ہے

سازِ شکستِ دل کوئی نغمہ نیا نہیں
تم نے بہت قریب سے شاید سنا بھی ہے

سنتا ہوں آپ اپنی ہی آوازِ بازگشت
یا میرا اس جہاں میں کوئی ہمنوا بھی ہے

دوشِ نسیمِ صبح پہ پھر دیکھئے کب آئے
وہ ایک موجِ زلف کہ نغمہ سَرا بھی ہے

○

سلگ رہا ہوں سلگنے ہی دو جلاؤ مت
مجھے قریب سے دیکھو قریب آؤ مت

موسموں کے اثر تلے کیا کیا
رنگ پھوٹے شجر تلے کیا کیا

آتی ہے درِ دل پہ تو دے جاتی ہے دستک
مانا کہ تری یاد کم آمیز بہت ہے

میں نے پوچھی نہ اس نظر نے کہی
وہ جو اک بات نامہ بر نے کہی

زندگی کا سفر کٹا تنہا
اِک کہانی سی رہ گزر نے کہی

سِل گئے لب تو داستانِ جنوں
داغ ہائے دل و جگر نے کہی

دل کا ہر زخم تھا لبِ گویا
کیا نئی بات چارہ گر نے کہی

○

الزام تراشیں تو الزام تراشیں کیا
احباب سمجھتے ہیں الزام تراشیں کیوں

کچھ دُور تو چلنے دو، خود لوگ سمجھ لیں گے
رہبر ہیں کہ رہزن ہیں ہم نام تراشیں کیوں

تقدیر میں پتھّر ہیں پتھّر ہیں تو کیوں ان سے
تقدیر نہ پھوڑیں ہم اصنام تراشیں کیوں

کیوں نام ترا آئے گمنام نہ مر جائیں
اشعار سنائیں کیوں ابہام تراشیں کیوں

○

گُل کھلائے فصلِ گُل اِس بار کیا
دیکھئے ہو صورتِ گلزار کیا

کیا خبر کب درد کی لے ٹوٹ جائے
چھیڑ دیں کب سازِ دل کے تار کیا

ہر قدم ہے اک صدائے رفتگاں
زندگی بھی ہے سبک رفتار کیا

کچھ تو ہے اہلِ قفس کچھ تو کہو
ہے یہ ہنگامہ پسِ دیوار کیا

وہ جو کہتے ہیں بیاں ہے اُن کا
پر یہ انداز کہاں ہے اُن کا

اب سرِ راہِ گماں کوئی نہیں
ایک سایہ سا رواں ہے اُن کا

ہائے وہ عیش کے لمحاتِ سبک
اب تصور بھی گراں ہے اُن کا

قطرۂ اشک گہر تھے جب تھے
اب تو احساسِ زیاں ہے اُن کا

○

اس تکلف کی کیا ضرورت تھی
منتظر تھا میں جاں بلب تو نہ تھا

یاد آنا ترا عجب تو نہ تھا
چاند کوئی رفیقِ شب تو نہ تھا

لوگ محفل میں اجنبی تو نہ تھے
تذکرہ میرا بے سبب تو نہ تھا

رات بھر جھلملا کے ڈوب گئے
زندگی کے اُفق پہ غم کے دیئے

شہر کا بے کراں یہ سناٹا
اک قیامت ہے اجنبی کے لیے

مسکراتے ہیں جگنوؤں کی طرح
جھیل کی گود میں کنول کے دیئے

یہ درختوں کے بے زباں سائے
مجھ سے کہتے ہیں ٹھہرنے کے لیے

کوئی کب تک بدستِ زخم آلود
اپنا دامانِ تار تار سیئے

○

ہوئیں آنکھیں عجب بے حال اب کے
یہ بارش کر گئی کنگال اب کے

ہنگامہ ہائے گرمیٔ بازار لے چلے
تہمت سی شۓ اُٹھا کے خریدار لے چلے

یہ بھی خیالِ خاطرِ احباب ہے کہ ہم
دل میں چھپا کے دشنۂ اغیار لے چلے

کیا بستیاں اُجاڑ کے وارفتگانِ شوق
صحرا میں حسرتِ درودیوار لے چلے

ہر چند ناگزیر ہے لیکن نہ اس قدر
جس سمت چاہے وقت کی رفتار لے چلے

زلفوں کی نرم چھاؤں میں وہ نیند تھی کہ بس
ہم پھر بھی اپنے ذہن کو بیدار لے چلے

○

اب جہاں دھوپ ہے وہاں سر پر
سایۂ زلفِ آسماں بھی ہے

آج ہم ہیں تو آج دنیا میں
قیمتِ جنسِ رائگاں بھی ہے

حمد

مٹّی پانی آگ ہَوا سب تیرے ہیں
سورج تیرا دَھرتی تیری
چھایا تیری مایا تیری
بادل تیرے بجلی تیری
رنگ برنگی تتلی تیری
جگنو تیرے خوشبو تیری
گرمی بارش جاڑا تیرا
تیز سمے کا دھارا تیرا

نیلا گنبد زرد کبوتر
جگمگ تارے سب تیرے ہیں

میری آنکھیں میرا تن من
میری سانسیں میرا جیون

میرے بچّے میرا آنگن
میرے اپنے میرے سپنے
سب دھوکا ہے سب تیرے ہیں

دعا

جسم تحلیل ہوئے، روح بیمار ہوئی
پابہ زنجیرِ گراں بار ہوئی
اے خداوندِ جہاں
میری منزل کا نشاں
آسماں ہے کہ دھواں

اے مرے ربِّ جلیل
میں نہ عیسیٰ نہ خلیل

میرے ہونے کی دلیل
آگ میں پھول کوئی

برسرِ ریگِ زباں
چشمۂ آبِ رواں

سلسلہ ہائے خبر
از سفر تابہ سفر

جسم سے جسم تلک
روح سے روح تلک

از کراں تا بہ کراں
اے خداوندِ جہاں

اے مرے ربِّ جلیل۔ میرے ہونے کی دلیل

جلاوطن

شاخ سے گل نے اک سوال کیا
ہم کو قدرت نے بے مثال کیا

بات کیا تیری دسترس میں نہیں
کیا مرے شعلۂ نفس میں نہیں

ہم گلستاں میں ہیں قفس میں نہیں
سُن کے گلچیں کا خواب ٹوٹ گیا

شاخ سے گل کا ہاتھ چھوٹ گیا

مسافر

دیکھ کر مجھ کو مضمحل تنہا
چند سائے سے آ گئے نزدیک
میں نے چاہا کہ اُن سے مانگوں بھیک

حسرتوں کا ہجوم تھا دل میں
موجزن تھا سکوتِ رودِ نیل
آنسوؤں نے جلا دی اِک قندیل

رات جتنی اُداس تھی پہلے
آج اُتنی اُداس بھی تو نہیں
روشنی آس پاس بھی تو نہیں

○

صرف مانع تھی حیا بندِ قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

خون کی روشنی

اے مرے خون کی روشنی
اور تابندہ ہو اور تابندہ ہو

چہرۂ دہر پر
ماہ پر مہر پر
تیرگی کے نشاں صورتِ داغ ہیں
اور ہر قطرۂ خونِ دل ایک سیارہ ہے جو کہ
گردش میں ہے
روشنی کے لیے
زندگی کے لیے
آگہی کے لیے
اے مرے خون کی روشنی
اور تابندہ ہو اور تابندہ ہو

اپنے نواسے مزمّل کے لیے

میرے پیروں میں ننھّے منّے پیار کی اِک زنجیر پڑی ہے
گویا اک تصویر کھڑی ہے
گھر سے باہر جاؤں تو محسوس کروں میں
کہ زنجیر بڑی ہے
گھر میں لَوٹ کے آؤں تو محسوس کروں میں
کہ زنجیر کڑی ہے
منّے تیرا پیار بڑا ہے
پیار کا ہر اظہار بڑا ہے
اور میں تیرے پیار کے آگے ننھّا منّا سا لگتا ہوں
تیرا منہ تکتا ہوں
دل ہی دل میں کہتا ہوں
میرے مولا پیار کی اس زنجیر کو میرے خوابوں کی تعبیر بنادے
فردا کی توقیر بنادے
دنیا کی تقدیر بنادے

ٹکنالوجی

چاند ہمالہ کی ایک برف بستہ چوٹی پر کھڑا
سورج کے نکلنے کا منتظر ہے
اُدھر وہ سورج
سمندروں پر پڑاؤ ڈالے
شعاعوں کو حکم دے رہا ہے
کہ اِن کے سینوں میں آگ بھر دو
انہیں تپاؤ
اور ہَواؤں سے کہہ دو
کہ جیسے ہی ان کے جسم کا سونا اور چاندی پگھلے
اور جیسے ہی ان کے سینوں سے بھاپ نکلے
اُسے اُٹھالے
اور لے جائے اک ایسی سرزمیں پر
جہاں کی مِٹّی
خدا کے وعدے کی منتظر ہے
اور جب میں کل اُدھر سے گزروں تو دیکھوں
کہ کھیت گنگنا رہے ہیں
چمنیاں دف بجا رہی ہیں

پچھتاوا

بس اسٹاپ سے گزرنے والی
تمام ممکنہ بسیں گذر چکی ہیں
مگر وہ لڑکی
کہ جس کے ہاتھ میں اک پر انار سالہ ہے
نئے جوڑے میں ملبوس
کسی نئے روٹ پرمٹ کے اجرا کے انتظار میں ہے
جانتی ہے
کہ بسوں کے پرانے نمبر بدل چکے ہیں
راستے بہت آگے نکل چکے ہیں

منشور

زمین ایک
زمین کی تمام نعمتوں کے سب امین ایک
زمین ایک
یہ لہلہاتی کھیتیاں
یہ سر بلند چمنیاں
جفاکشوں کی داستاں
حسین سے حسین ایک
زمین ایک
زمین کی تمام نعمتوں کے سب امین ایک

غزل

اُف یہ دلکش یہ دل آویز خطوط
یہ تراشا ہوا مرمر سا بدن

اِک حسیں پیکرِ تصویر ہے تُو
تجھ کو محسوس کیا ہے میں نے

گو سرِ صفحۂ قرطاس سہی
پر مرے ذہن کی تخلیق ہے تُو

میں کہ خالق ہوں ترا دیکھ مجھے
تجھ پہ لازم ہے پرستش میری

آ مری روح کے کاشانے میں
تجھ کو اک زندہ حقیقت کی طرح
جیسا محسوس کیا ہے، دیکھوں

وقت

قربتوں میں بھی ایک دوری تھی
اب تو ہم ہو گئے ہیں اور بھی دور

کتنا ظالم ہے زندگی کا سفر
سوچتا ہوں کبھی کبھی تنہا

جانے کس موڑ کس دوراہے پر
وقت کی آندھیاں اُمڈ آئیں

اور ہم سوچتے ہی رہ جائیں

○

پھر اُس کے بعد خواب کو آنکھیں ترس گئیں
آیا تھا ایک نیند کا جھونکا ہوا کے ساتھ

سنہرے خواب

وہ ہمارا بچپن تھا
جب ہم آسمان پر مِٹّی اُچھالا کرتے تھے
یہ ہمارا لڑکپن ہے
جب ہم اس گملے میں مِٹّی بچھا رہے ہیں
ہو سکتا ہے
کل اس گملے میں سرخ گلاب ہوں
اور ہماری آنکھوں میں
سنہرے خواب

قزّاق

یہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے تختے اور بادبان ہیں
لیکن ان ستاروں کے لیے
جو سرِ شام دریا میں ڈوب جاتے ہیں

ماہی گیر

سمندر اپنے جلال سے
اور ماہی گیر اپنے جال سے
پہچانا جاتا ہے

ایک خط سے اقتباس

تم نے دیکھا
کہ یہ سیّارے
ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کے خبط میں
آج تک معلّق ہیں

کھڑکیاں اور ستارے

آسمان یہ بات کیوں نہیں سمجھتا
کہ ہم
ایک وقت میں اتنے محاذ نہیں کھول سکتے

سرِ شام

اتنا ضرور ہے کہ ہم ہر روز سورج کی روشنی میں
ایک تاریک گھر سے
دوسرے تاریک گھر تک پہنچ جاتے ہیں

داستان گو

پھر یہ ہوا کہ میں
برگد کے درخت میں تبدیل ہو گیا

ناآفریدہ

میں آوازوں میں بٹ گیا ہوں
ہو سکتا ہے
ہر آنے والی آواز
میری ہی آواز ہو

کیٹلاگ

خدائے ذوالجلال
آنکھیں بند کیے دیکھ رہا ہے

آئینہ

یہ کیسی روشنی ہے
جو میرے اور خدا کے درمیان حائل ہے

کتبہ

پُرانی قبر پر
نیا کتبہ نصب نہیں کیا جا سکتا

ایک قبر کے پاس

زلزلے آسکتے ہیں
لیکن
دل دھڑکنے کی آواز نہیں آسکتی

قلعے کے اندر

دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتا ہوں
تو مجھے اپنے ہاتھوں کی اُنگلیاں
قید خانے کی سلاخیں معلوم ہوتی ہیں

پس منظر

ہم سوداگر ہیں
ہمیں یہاں قید کر دیا گیا ہے
اور سامنے جھیل میں جو عکس ہے
وہ اس قید خانے کی کنجی ہے

دعا

اب اگر میرے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں
تو انہیں دعا کے لیے اُٹھا لینا

اندھا

لیکن میرا مستقبل مجھ پر روشن ہے

موم بتی اور میں

میں اس کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا
کہ سامنے دُور تک اندھیرا ہے

ہیڈ مسٹریس

میں بچوں کے سامنے زندگی کا آموختہ دہراتی ہوں
بچے
مجھے علم بھی دیتے ہیں اور روٹی بھی

انتظار

ہمارے پاس
اپنے باپ کی محنت میں ہاتھ بٹانے کا اک یہی طریقہ ہے
کہ ہم
اس روٹی کو آپس میں بانٹ لیں

معبدوں کے چراغ

معبدوں میں چراغ جلانے والے آگئے ہیں
اس سے پہلے کہ یہ رات جہنم میں تبدیل ہو
ہم اپنے اندر سے سچ برآمد کر لیں

جالے سے باہر

سمندر کی لہریں چٹان سے ٹکراتی ہیں
اور لوٹ جاتی ہیں
مکڑی اپنے اطراف جال بنتی ہے
اور خود قید ہو جاتی ہے

نیلم

یہ میری آنکھوں کے نیلم ہیں
ان میں ایک شام کا اور
ایک صبح کا ستارہ ہے

زینہ

باپ بچے کو چھت پر
اور بچہ آسمان پر
چاند کو دیکھ رہا ہے

مچھلیاں

ہم ماہی گیر کے جال میں ہیں
اور ماہی گیر
ایک سنہرے جال میں

سمندر

میرا کوئی حریف نہیں ہے
میں اپنے آپ سے جنگ کر رہا ہوں

میّت کی آواز

میں گھر کی ایسی چوکھٹ ہوں
جسے دیمک کھا گئی ہے
میں اب کسی کا خیر مقدم نہیں کر سکتی

تمثیل

شاید ہم کسی دریا کا خواب ہیں
اور ہمارے خواب
کسی نادیدہ دریا کے وجود کی تمثیل

آخری چراغ

اس بستی کے سارے چراغ ایک جیسے ہیں
تم اپنے دل کا آتش کدہ بجھنے نہ دینا
کہ یہ اس مقدّس مٹّی کا آخری چراغ ہے

رات

کیا یہ بات ہمارے لیے فخر کی نہیں
کہ چاند
ممتاز سفارت کار ہونے کے علاوہ
ایک خوبصورت شاعر بھی ہے

ماہی گیر

ماہی گیروں کو یقین ہے
کہ سورج کی سنہری انگوٹھی کو
کسی سمندری مچھلی نے نگل لیا ہے

ہائیکو

چاول کے دانے
اک اک کر کے کیا جھٹ پٹ
جینے چڑیا نے

پتے میں لپٹا
سرد ہوا کا جھونکا بھی
لگتا ہے تیکھا

گرمی کا احساس
اور زیادہ ہوتا ہے
دیکھ کے ٹھنڈی گھاس

آیا سال نیا
چڑیا چہکے اوہو ہو
امبر آہاہا

شبنم کے قطرے
ڈول رہے ہیں سبزے پر
ہولے ہولے سے

برفانی موسم
سمٹیں اور کہاں تک اب
اپنے گھر میں ہم

طوفانی جھکڑ
روک نہ پائے جنگل میں
مینڈک کی ٹرٹر

ٹھیر گیا دریا
سورج ڈوبا شام آئی
دھندلایا سبزہ

سمت نما گاڑی
ڈھونڈ رہی ہے کہرے میں
وحشی آبادی

پیاری الہڑ سی
دُور کہیں ویرانوں میں
مسکائے چیری

دانہ ڈالیں آپ
لڑنا دیکھیں بطخوں کا
یہ بھی ہے اک پاپ

مینڈک کا نغمہ
پہلے نغمہ لگتا ہے
آخر میں نوحہ

آپس میں یکجا
مینڈک ایسے بیٹھے ہیں
جیسے اک کنبہ

کیسا جاڑا ہے
کاغذ جیسا سیلا تھا
اب تک سیلا ہے

ہائیکو

کس نے دیکھا ہے
وقت بتانا جانے کیوں
اچھا لگتا ہے

چلتا رہتا ہوں
اپنے من کی اگنی میں
جلتا رہتا ہوں

پاسِ مراتب ہے
رُخ تو ورنہ کعبے کا
میری جانب ہے

ممتا کا دم تھا
یا بچے کی ایڑی میں
آبِ زم زم تھا

رَستہ چلنا ہے
لمحوں کے اس جنگل میں
دن تو ڈھلنا ہے

بے موسم ایسے
آتے جاتے یہ بادل
لگتے ہیں کیسے؟

دریا بہتا ہے
کوئی ایسے موسم میں
گھر میں رہتا ہے

دشمن پودوں کی
بادِ صرصر محسن ہے
سُوکھے پتّوں کی

کچھ بھی یاد نہیں
سارے قصّے دل کے تھے
دل ہی شاد نہیں

منہ چمکائے دھوپ
آگے پیچھے گوری کے
پھول بھریں بہروپ

گوری تیرا رُوپ
سایا ناچے آنگن میں
دیواروں پہ دھوپ

ایسے میں اے کاش
کوئی میرے ہونٹوں پر
رکھ دے سیب کی قاش

بے سر اور بے تال
اک دُوجے کی چوکھٹ پر
موسم کھیلیں چال

کون مرا ہم راز
بے حس ان دیواروں کے
کون اُٹھائے ناز

اک دوجے کی چوکھٹ پر
موسم کھیلیں حال

کون مرا ہمراز
بے حس ان دیواروں کے
کون اُٹھائے ناز

شہر میں قحطِ آب
اس پر سورج دکھلائے
اپنی آب و تاب

خالی بادل ہے
اکثر آتا رہتا ہے
دھرتی پاگل ہے

ہوتا ہے اکثر
چیونٹی کو بھی بارش میں
لگ جاتے ہیں پر

مکڑی کا جالا
دیواروں کے زخموں پر
روئی کا گالا

بچّے پاکھنڈی
آتے جاتے رہتے ہیں
دیکھے پگڈنڈی

باغوں میں تتلی
بچّوں پر کر دیتی ہے
کوئی عمل سِفلی

موسم جاڑے کا
اک دن ہو تو لے آؤں
کمبل بھاڑے کا

کیا جنگل کیا گھر
سارے موسم اک جیسے
مٹّی کے اندر

بالوں میں جوڑا
کنگن بولے ہاتھوں میں
آنکھوں میں کجرا

سورج کی کرنیں
اونچے نیچے ٹیلوں پر
چلتی رہتی ہیں

بارش میں بُلبل
باندھ رہی ہے کس کے لیے
آوازوں کا پُل

کشتی رانی میں
وحشت کرنے لگتے ہیں
سائے پانی میں

پتے پت جھڑ میں
جنگل شور مچاتا ہے
آندھی جھکڑ میں

رہ کر خود پیاسا
دریا پیاس بجھاتا ہے
ہم روکیں رستہ

گھر میں گلدستہ
دیکھ رہا ہے کھڑکی سے
بارش کا رستہ

پانی بادل پر
دھرتی دوڑے بیچاری
گھٹنوں کے بَل پر

تنہا اک کونپل
ویرانے کو للکارے
دکھلائے کَس بَل

صبحِ یخ بستہ
سورج شاید کہرے میں
بھول گیا رستہ

بادل کا سایا
مانگ رہا ہے دھرتی سے
خوشبو کا تحفہ

پیچھے فردا کا
آگے آگے سایا ہے
عمرِ رفتہ کا

پودوں کے چہرے
پیلے کیوں پڑ جاتے ہیں
پت جھڑ سے پہلے

برفانی موسم
آتش دان میں لایا ہے
یادوں کا البم

بارش کا پانی
بھنگڑا ڈالے کھیتوں میں
سوئے دہقانی

ہاتھوں میں پتّھر
مستقبل کا بوجھ الگ
بچّوں کے سر پر

کیسی برقی رَو
اپنے اندر رکھتے ہیں
گلہائے خودرو

چھوٹے چھوٹے گھر
چھوٹی چھوٹی آشائیں
چھوٹے چھوٹے در

بارش کے اندر
ننھّی ننھّی بوندوں کے
بہتے جائیں گھر

پیچھے کچّے گھر
آگے چُونے پتّھر کے
اونچے اونچے در

آنکھوں کی اندھی
راہ دکھائے لوگوں کو
پاگل پگڈنڈی

اس دھرتی سے کیا؟
کر سکتا ہے سرتابی
دھرتی کا جایا

میں نے دیکھا کل
پانی کے اک چشمے پر
بیٹھا تھا جنگل

ایسا لگتا ہے
دریا کی تہہ میں کوئی
سایا رہتا ہے

صورت پت جھڑ کی
ٹک ٹک دیکھے پانی میں
دہقانی لڑکی

دریا بستی سے
قطرہ قطرہ لے جائے
چابکدستی سے

کیسے سپنے ہیں
جن آنکھوں میں رہتے ہیں
ان کو ڈستے ہیں

اُجڑے اُجڑے گھر
جگمگ جگمگ جنگل میں
کالی کا مندر

گھر کی چھتری پر
زرد کبوتر شام ڈھلے
آتا ہے اکثر

جیون ساگر میں
روشن روشن اک چہرہ
میں پس منظر میں

عظمت کے آگے
دریا پانی بھرتے ہیں
پربت کے آگے

جینا دریا سے
میں نے مرنا سیکھا ہے
اپنے آبا سے

تنہائی کے دن
کائیں کائیں یادوں کی
لمحوں کی بھن بھن

کیا کرتے ہم بھی
خشک ہوا گر لے جاتی
آنکھوں کا نم بھی

منزل پہ آ کے
بھید کُھلا ہم بھاگے تھے
سائے کے پیچھے

پہلے ہم بھاگے
پھر دیکھا تو اک دنیا
ہم سے تھی آگے

فرقت کا مارا
شور مچائے گلیوں میں
آوارہ پتّا

ہوتا ہے ساجن
لہجے میں بھی موسم کا
اپنا تیکھا پن

اُجبک شہزادی
ڈھونڈ رہی ہے کانٹوں میں
پھولوں کی وادی

گھر گھر میں جاپان
لیکن میرے دل میں ہے
میرا پاکستان

سنتے ہیں اس گلی میں
اک شخص منحنی سا

کچھ رنگ گندمی سا
ہونٹوں پہ مسکراہٹ

آنکھوں میں کچھ نمی سی
باتوں میں زندگی سی
کچھ دن سے آبسا ہے

تم جس کو ڈھونڈتے ہو
یہ شخص وہ نہیں ہے
وہ شخص اب کہاں ہے؟

کون دل کی زباں سمجھتا ہے
دل مگر یہ کہاں سمجھتا ہے

به اہتمام

خواجہ آشکار اکادمی

ناشر

ایس آر پبلی کیشنز، 42، پریس چیمبرز، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی